تحقیقی و تنقیدی مجلّہ

دریافت

جلد:15 شمارہ:01

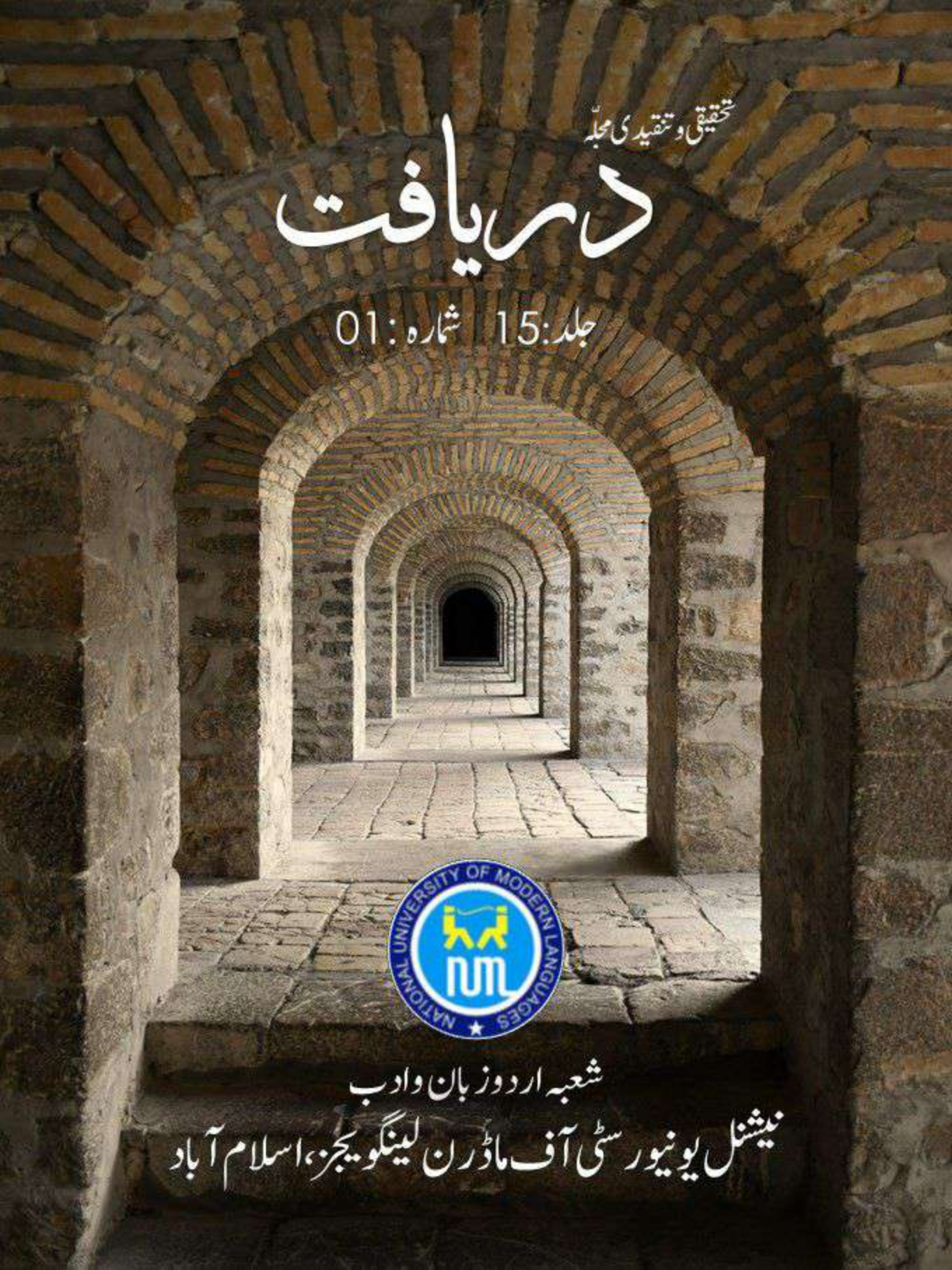

شعبہ اردو زبان و ادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

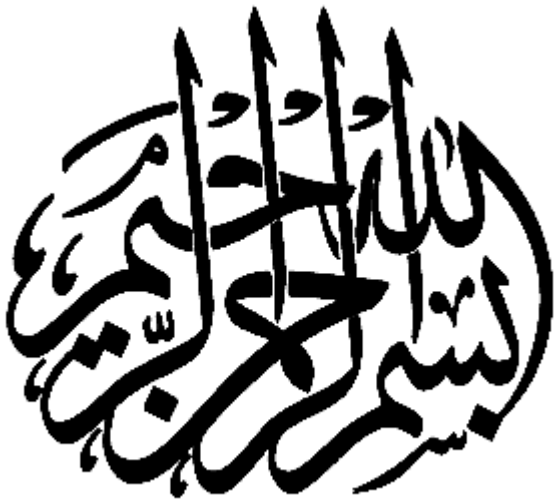
بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

۱۔ "دریافت" ایچ۔ای۔سی (HEC) سے منظور شدہ "Y" کٹیگری کا حامل تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ایچ۔ای۔سی (HEC) کے طے کردہ اصول و ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مقالات کا اشاعت سے قبل اندرون ملک اور بیرون ملک ماہرین سے "Double Blind Peer Review" ہوتا ہے جس میں دو سے تین ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳۔ دریافت کی اشاعت سال میں دو دفعہ بالترتیب جون اور دسمبر میں ہوتی ہے۔

۴۔ "دریافت" کا اختصاص اردو زبان و ادب کے درج ذیل زمروں میں معیاری مقالات کی اشاعت ہے:

ا۔ تحقیق: متنی / موضوعی۔ ب۔ مباحث: علمی / تنقیدی۔

ج۔ مطالعہ ادب: اردو فکشن / شاعری۔ د۔ تنقید و تجزیہ: اردو فکشن / شاعری، اقبال شناسی وغیرہ

۵۔ تراجم اور تخلیقی تحریریں مثلاً غزل، نظم، افسانہ وغیرہ قطعاً ارسال نہ کی جائیں۔

۶۔ "دریافت" میں مقالہ بھیجنے کے بعد اس کے انتخاب یا معذرت کی اطلاع موصول ہونے تک مقالہ کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

۷۔ "دریافت" کی ایچ۔ای۔سی (HEC) میں طے شدہ درجہ بندی 'اردو' ہے۔ دیگر شعبہ جات کے اسکالرز مقالات نہ بھیجیں۔

۸۔ مقالہ اُردو زبان میں ہونا چاہیے۔ کسی دوسری زبان میں لکھا جانے والا مقالہ ناقابلِ قبول ہو گا۔

۹۔ مقالہ بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

i۔ مقالہ صرف OJS (https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft) پر ارسال کیا جائے۔

ii۔ نمل ریسرچ پالیسی کے مطابق مقالے کی فیس -/13,000 روپے مقرر کی گئی ہے تفصیل کے لیے ویب گاہ ملاحظہ کیجیے۔

iii۔ مقالے کا عنوان، محقق کا نام اور عہدے کے متعلق تمام تفاصیل اُردو اور انگریزی کے درست ہجوں کے ساتھ درج کی جائیں۔

iv۔ مقالے کا ملخص (Abstract) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً ۱۵۰-۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ نیز مقالے کے کلیدی الفاظ Keywords بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے جائیں۔

v۔ مقالے کی موصولی، مقالے کا قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع صرف برقی پتا (E.Mail) کے ذریعے دی جائے گی۔ اس لیے مقالہ نگار اپنا مستند برقی پتا، اپنا مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی درج کریں۔

vi۔ مقالے کے ساتھ الگ صفحے پر حلف نامہ منسلک کیا جائے کہ یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، مسروقہ یا کاپی شدہ نہیں ہے۔

vii۔ کمپوزنگ Microsoft Word میں ہو۔ (فائل: A4، مارجن چاروں جانب ایک انچ)۔ متن کا فونٹ سائز ۱۳ رکھا جائے۔ مقالے میں ہندسوں کا اندراج اردو میں ہو۔ مقالے کے لیے صفحات کی تعداد کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ہے۔

viii۔ مقالے کے آخر میں حوالہ جات اردو کے ساتھ ساتھ **Roman Script** میں بھی ضرور درج کیے جائیں۔ بصورت دیگر مقالہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

ix۔ حوالہ جات میں ایم ایل اے (MLA) فارمیٹ کی پیروی کی جائے۔

x۔ مقالے میں کہیں بھی آرائشی خط، علامات یا اشارات استعمال نہ کیے جائیں۔

xi۔ مجوزہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں مقالہ رد کر دیا جائے گا۔

دریافت

جلد:15 شمارہ:01

ISSN Online : 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

سرپرستِ اعلیٰ

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری)، ریکٹر

سرپرست

ڈاکٹر محمد زبیر اقبال، پرو ریکٹر، آر اینڈ ایس آئی ڈویژن

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

مدیر

ڈاکٹر ظفر احمد

معاون مدیر

ارشد محمود ہادیؔ

تحقیقی معاون

سدرہ طاہر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

E-mail:daryaft@numl.edu.pk

Web(OJS): https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

مجلسِ ادارت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار

صدرِ شعبہ اردو زبان وادب چیئر، استنبول یونیورسٹی، استنبول، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر آسمان بیلن اوزجان

صدرِ شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام

شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز، الازہر یونیورسٹی (گرلز کیمپس)، قاہرہ، مصر

مجلسِ ادارت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

ڈائریکٹر، انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

صدرِ شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

شعبہ اردو، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر ہنس ورنر ویسلر

شعبہ لسانیات اور فلالوجی، اپسالا یونیورسٹی، اپسالا، سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر شہاب الدین

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین جینابڑے

سنٹر فار انڈین لینگویجز، سکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل سٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نیو دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر محمد محفوظ احمد

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، انڈیا

ڈاکٹر آرزو سوزین

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف استنبول، استنبول، ترکیہ

مجلسِ مشاورت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک

چیئرمین، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر ضیا الحسن

انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

صدرِ شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم

چیئرپرسن، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس

چیئرپرسن، شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان، پاکستان

~~~~~~

جملہ حقوق محفوظ

دریافت جلد:15 شمارہ:01 (جنوری تا جون 2023ء)
سرورق: شیکی کاروان سرائے، شیکی، آذربایجان۔ عکاسی: ڈاکٹر ظفر احمد
ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
رابطہ: شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ/نائن، اسلام آباد
فون:10-9265100-051/2262:Ext ای میل: daryaft@numl.edu.pk
ویب سائٹ(OJS):https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft
قیمت فی شمارہ:600روپے۔ بیرون ملک:5ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)
~~~~~~

فہرست

اداریہ

ترقی پسند شعری روایت اور اردو غزل	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۱
چین میں اردو تدریس کی روایت کا تجزیہ	لی فانگ دا / ڈاکٹر یوان یوہانگ	۲۱
اردو تحقیق میں 'نمونہ بندی' کی تکنیک کا استعمال: ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد حامد / ڈاکٹر سلمیٰ اسلم	۳۰
"جانگلوس" میں تانیثیت کے مقامی پہلو: تجزیاتی مطالعہ	وسیم عباس / ڈاکٹر عزیز ابن الحسن	۴۲
اقبال کی فکری سرگزشت: تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر محمد عامر اقبال / ماریہ بلال	۵۶
ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم نگاری	ڈاکٹر وجیہہ شاہین / ڈاکٹر قمر عباس	۶۸
خالد فتح محمد کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری	عظمت شہزاد / ڈاکٹر غنچہ بیگم	۸۶
مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں سماجی و نفسیاتی تناظرات	ڈاکٹر اللہ یار ثاقب / ڈاکٹر سائرہ ارشاد	۶۵
سفر ناموں کا تکنیکی اور اسلوبیاتی مطالعہ	ڈاکٹر روبینہ پروین	۱۰۴
انڈیکس	سدرہ طاہر	۱۱۶

اداریہ

معاصر بین العلومی سماج میں زبان و ادب کی تعبیر اور تجزیے کے روایتی طریق کار بدل گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو تحقیق و تنقید کے مفہوم اور مقصد کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اس لیے جب تک موجودہ زمانے کی بصیرتوں کا ادراک نہیں ہو گا تب تک زبان و ادب کی تفہیم کا روایتی زاویۂ نظر بھی نہیں بدلے گا۔ ایک ادیب، محقق اور نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معاصر "اے پسٹیمی"(Episte'me) یا فکری نظام سے آگاہ ہو۔ معاصر فکری، علمی، فلسفیانہ اور لسانی صورتحال کے فہم سے ہی اجتماعی دانش ورانہ شعور ترتیب پا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر تفہیم و تجزیے کے طریق کار میں مغائرت در آتی ہے۔ کسی محقق یا نقاد کی عمومیت پسندی اس مغائرت کو تشویش ناک حد تک بڑھا سکتی ہے۔ اس لیے معاصر سماج میں محقق اور نقاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاصر فکر کی تفہیم کا درست زاویۂ نظر پیش کرے۔

اردو زبان و ادب میں تحقیق و تنقید کی نظری و عملی صورتیں کثیر تعداد میں نظر آتی ہیں تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ ان میں ایک فکری ہم آہنگی نظر آئے، ایک تحقیقی و تنقیدی یا علمی و فکری مؤقف نظر آئے جو معاصر علمیات کے تقاضوں سے نہ صرف مماثلت رکھتا ہو بلکہ عالمی فکر کے متوازی اپنی ایک مخصوص شناخت کا باعث بھی ہو، نیز ادبی، سماجی و ثقافتی لحاظ سے گہرا تجزیاتی شعور بھی نظر آئے۔ اس طرزِ فکر کی روشنی میں زبان و ادب کی تفہیم اور تعبیر کا معاصرانہ مزاج امتیازی بصیرتوں کا حامل ہو سکے گا۔ ایک ادیب اور قاری اس وقت ہی ان معاصرانہ بصیرتوں سے واقف ہو سکے گا جب محققین اور ناقدین ان بصیرتوں کی اہمیت سے آگاہ ہوں گے اور ان سے استفادہ کرنے کے قائل ہوں گے۔

اردو زبان و ادب سے وابستہ اہلِ دانش کو چاہیے کہ نئے دور کی فکری تبدیلیوں کو محسوس کریں اور ان فکری تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنی رفتار تیز کریں اور ایک ایسا ڈسکورس تشکیل دیں جو عالمی سطح پر ہماری شناخت کا ذریعہ ہو اور وہ اسکالرز جو جامعات اور کالجوں کے اساتذہ، محققین اور ناقدین کو اپنی اصلاح کا اہم وسیلہ سمجھتے ہیں، وہ بھی ان وسائل سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے لیے ہمارے مخصوص مقامی، ثقافتی میکانزم میں تحرک کا ہونا ضروری ہے۔ یہ فکری تحرک اہلِ دانش کی مجموعی کوشش اور وسیلے سے ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

عام قارئین کے علاوہ اردو زبان و ادب کی تحقیق و تنقید میں دلچسپی رکھنے والے ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے لیے خصوصی طور پر دریافت کے جلد ۱۵ شمارہ ۱ کو مرتب کیا گیا ہے جس میں ادب کے ثقافتی و سماجی زاویوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہم ان تمام ملکی و غیر ملکی مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے معیاری مقالات لکھ کر اس مجلّے میں شائع ہونے کے لیے فراہم کیے ہیں۔ دعا ہے کہ زبان و ادب پر تحقیق و تنقید کی یہ شمع ایسے ہی روشنی بانٹتی رہے۔

مدیران

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI #https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.332

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
افسانہ نگار اور نقاد

ترقی پسند شعری روایت اور اردو غزل

Dr. Mirza Hamid Baig
Fiction writer & Critic

Progressive Poetic Tradition and Urdu Ghazal

ABSTRACT

This article explores the intersection between the Progressive poetic tradition and the ghazal. The Progressive movement, known as "Taraqi Passand" in Urdu, emerged as a literary movement in the 20th century, aiming to challenge conventional poetic norms and embrace new ideas and social realities. While the ghazal traditionally revolved around themes of love, longing, and beauty, the Progressive poets sought to expand its boundaries and infuse it with socio-political relevance. This article delves into the historical context of the Progressive poetic tradition, highlighting its goals of addressing social injustices, advocating for political reform, and amplifying the voices of marginalized communities. By incorporating these concerns into the ghazal, the Progressive poets transformed the traditional form into a powerful tool for social commentary and critique. Furthermore, this article discusses the thematic evolution of the ghazal within the Progressive tradition. It explores how the poets expanded the traditional themes to encompass issues of inequality, poverty, discrimination, and the challenges of modernization. By doing so, the Progressive poets widened the scope of the ghazal and made it a reflection of the changing times and the evolving concerns of society. Through an exploration of the blending of the ghazal's structural framework with progressive ideas, this article emphasizes the significant role played by the Progressive poets in shaping the modern Urdu literary landscape. By infusing the ghazal with socio-political perspectives, they brought depth, diversity, and relevance to the traditional form, and in turn, opened new possibilities for poetic expression. In summary, this article highlights the symbiotic relationship between the Progressive poetic tradition and the ghazal, showcasing how the poets of this movement used the form to convey their socio-political concerns and contribute to the broader discourse of their time.

Keywords: *Progressive, poetic tradition, urdu ghazal, ghazal movement,*

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ تھا۔ شعری اُفق پر کلاسیکی رنگِ تغزل کے نمائندہ شُعراء جگر مراد آبادی، چراغ حسن حسرت اور بہزاد لکھنوی چھائے ہوئے تھے۔

Received: 12thFeb, 2023 | Accepted: 1st June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اِس صورت سے تڑپا، اُن کو پیار آ ہی گیا
(جگر)

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
(جگر)

اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا
(جگر)

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ، ہرچیز مُقابل آجائے
منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے
(بہزاد لکھنوی)

ہندی بحُور میں گیت نگاری کرتے ہوئے حفیظ جالندھری کی مُترنم لے، "ابھی تو میں جوان ہوں"، "جاگ سوزِ عشق جاگ" اور رُومانی شعراء کے سرخیل، اختر شیرانی کی نظمیں: "وادی گنگا میں ایک رات"، "سلمٰی" اور "اے عشق کہیں لے چل"، نوجوان نسل کو خون کے آنسو رُلا رہی تھیں۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو شعری اصناف کی سطح پر قصیدہ اور مثنوی کا زمانہ لد چُکا تھا۔ مرثیہ خال خال تھا اور رُباعی کے ایوان میں جوش، فراق، اثر صہبائی اور ساغر نظامی کے نام گونجتے تھے۔ جگر مُراد آبادی اور صُوفی تبسم قطِعہ نگار شعراء کے طور پر تحریک کا حصہ بنے لیکن قطِعہ نگاری کی تحریک کی خاص عطا اختر انصاری دہلوی تھے جن کے زیرِ اثر احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری اور مصطفیٰ زیدی نے بھی قطِعہ نگاری کی اور بالآخر نظم کے ہو رہے۔

وہ یوں کے تحریک کے آغاز میں شاعرانہ خیال کی سطح پر نظم میں ارتکاز اور تسلسلِ خیال کی موجودگی اور غزل میں متحد المعنی تسلسلِ خیال کی عدم دستیابی کے سبب غزل مردود قرار پائی۔ جوش ملیح آبادی، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، ظ۔ انصاری اور سردار جعفری نے کلاسیکی لحن منسوخ قرار دیا۔ اُن کے لیے شعراء کے ہاں کلاسیکیت کی ہلکی سی جھلک بھی ناگوارِ خاطر تھی۔ صنفِ غزل کے ردّ اور حمایت میں "کلیم"، دہلی، "ساقی، دہلی"، "ادب لطیف"، لاہور "صبا" اور "آبشار"، حیدر آباد، "شاہراہ"، دہلی، "سوغات"، "بنگلور"، "نگہت، الہ آباد، "سہیل"، گیا، "نگار" لکھنؤ، ماہِ نو" کراچی، "مورچہ"، گیا اور "پگڈنڈی"، امرت سر کے صفحات پر معرکہ آرائی ہوئی لیکن اُس دور میں

اس ڈر سے کہ رجعت پسند نہ کہلائیں، اچھے خاصے غزل گو شعراء نے غزل گوئی ترک کر دی اور طبیعت پر جبر کر کے صرف نظم کے ہو رہے۔ غزل کہی بھی تو اِس نوع کی۔

لال پُھریرا اِس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی، مُلک ہمارا ہو کے رہے گا
لینن کے پیغام کی جَے ہو، اِسٹالن کے نام کی جَے ہو
جَے ہو اِس دھرتی کی جس پر، اپنا اَجارا ہو کے رہے گا
(مجروح سلطانپوری)

امن کا جھنڈا اِس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا، مارلے سا تھی جانے نہ پائے
(مجروح سلطانپوری)

حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری " (۱۸۹۳ء) اور عظمت اللہ خاں کے مضمون:"شاعری" مطبوعہ: "اردو"، "اورنگ آباد" (۱۹۲۳ء) میں بالترتیب "غزل میں صداقت کے فقدان" اور "ریزہ خیالی" کے سبب صنفِ غزل کی مخالفت پُرانی بات ہو چلی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی غزل دشمنی کا آغاز جوش ملیح آبادی کے رسالہ "کلیم"، دہلی، مئی ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والے مضمون، "غزل گوئی" سے ہوا، جو حکیم آزاد انصاری کے مضمون:"غزل کی حمایت"، مطبوعہ:"جامعہ"، دہلی، بابت: جنوری ۱۹۳۷ء کے ردّ میں لکھا گیا تھا۔ جوش نے غزل کی مخالفت کرتے ہوئے فانی بدایونی کو "مرگھٹ کا رونے والا" قرار دیا۔

> "فراق گورکھ پوری نے "نگار"، لکھنؤ بابت: جولائی ۱۹۳۷ء میں "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے اُس کا جواب کیا لکھا، جوش کی حمایت میں عندلیب شادانی اُٹھ کھڑے ہوئے اور رسالہ "ساقی"، دہلی میں اگست ۱۹۳۷ء تا نومبر ۱۹۴۰ء مسلسل غزل کے خلاف لکھتے رہے، جس کا سب سے مزیدار ردِّ عمل حفیظ جالندھری کے تحریر کردہ ایک استہزایہ مضمون:"کیا غزل کی اہمیت ختم ہو گئی" میں دیکھنے کو ملا۔"[1]

صنفِ غزل کی مخالفت میں تحریر کردہ جوش ملیح آبادی کے دو دیگر مضامین("غزل گوئی "مشمولہ: "اشارات" اور "تنگنائے غزل"، مطبوعہ:"ماہ نو"، کراچی، بابت: اگست ۱۹۵۸ء) بھی شائع ہوئے، جس کا جواب جمیل

الدین عالی، وامق اجمیری اور فضل احمد کریم فضلی نے غزل کے حق میں لکھ کر دیا، جس میں ممتاز حسین کے غزل مخالف مضمون: "غزل کی شاعری"، مطبوعہ: "ادب لطیف"، لاہور بابت: جولائی ۱۹۵۳ء کا جواب بھی شامل تھا۔

جوش کے بعد غزل کے خلاف سب سے نمایاں آواز سردار جعفری کی تھی جو تادیر سُنی گئی۔ انھوں نے بالخصوص فراق، فیض اور وامق جونپوری کی غزلوں میں پائے جانے والے روایت کے شعور کا مضحکہ اُڑایا۔ اُن کو غزل میں جوش ملیح آبادی کا بلند آہنگ لہجہ:

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

تک تو قبول تھا، لیکن فراق اور فیض کی غزلوں پر رُومان کی ہلکی سی پرچھائیں بھی اُن کے لیے ناگوارِ خاطر تھی۔ وہ آخر دم تک اس کا برملا اظہار کرتے رہے، جس کا اُنھیں ایک زمانے میں تُرکی بہ تُرکی جواب بھی ملا۔

اس حوالے سے فراق صاحب کہتے ہیں: "ترقی پسندوں کے کچھ عَلَم بردار" جس ترقی پسند ادیب کو اپنے نیاز مندوں میں نہیں شمار کرسکتے یا اپنے گٹ یا گروپ کا آدمی نہیں سمجھتے، اُس کی تخلیقوں کو، اُن تخلیقوں کی مقبولیت کو ۔۔۔۔۔ کچھ فتوے جاری کر کے بزعم خُود سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ فتوے کچھ اِس قسم کے ہوتے ہیں:

چارج شیٹ:

> "یہ تخلیق ۱۔ اینٹی مارکسٹ ہے ۲۔ عینی یا عینیت زدہ ہے ۳۔ تصوّف کی تبلیغ ہے ۴۔ انقلاب، پَرول تار اور ایسے دیگر مقاصد یا طبقوں کے لیے زہر ہے ۵۔ سو شلسٹ ریل ازم سے مُعرا ہے یا غلط نظریوں کی حامل ہے ۶۔ سیاسی لحاظ سے ناکافی "Not Political" ہے ۷۔ یہ ترقی پسندی نہیں ہے ۸۔ فرائڈ کے نظریوں کی شکار ہے ۹۔ دشمنِ عوام ہے۔"(۲)

اِن میں سے بیشتر اعتراضات چونکہ سردار جعفری کی طرف سے وارد ہوئے تھے، اس لیے فراق صاحب نے اپنی اِس تحریر میں انھیں "ترقی پسند پیر نابالغ" تک کہا۔ یہ جنوری ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ جوش کا تیسرا اور آخری مخالفانہ مضمون اگست ۱۹۵۸ء میں آیا۔ اس کا مطلب مئی ۱۹۳۷ء تا اگست ۱۹۵۸ء یہ قضیہ لگ بھگ اکیس برس تک چلا۔ البتہ بھیمڑی ترقی پسند کانفرنس ۱۹۴۹ء میں جاری کردہ انتہا پسندانہ منشور کے کچھ ہی عرصے بعد نامقبولیت اور اُس سے غیر اعلانیہ بغاوت، نیز احتشام حسین، ہنسراج رہبر، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام اور راہی معصوم رضا کے تحریر کردہ مضامین اور مکالموں سے غزل کے خلاف اُڑائی گئی گرد بیٹھی تو ترقی پسند شعرا نے ہی غزل لکھ کر ثابت کیا کہ غزل کی مُنتشر الخیالی ہی غزل کی اصل قوت ہے جو عوام و خواص کو ایک مُدّت سے گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ یُوں فراق

گورکھ پوری، صُوفی تبسم، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، عزیز حامد مدنی، ظہور نظر اور احمد فراز درجہ اول کی غزل لکھ کر ترقی پسند تحریک کا اثاثہ ثابت ہوئے۔ نظم سے متعلق تسلسلِ خیال سے بچ کر بڑے کلاسیکی غزل گو شعراء کی طرح چھوٹی بحُور میں غزلِ مُسلسل کہنے کا تجربہ بھی ہوا۔ چلمن میں گلاب کھل رہا ہے

یہ تُو ہے یا شوخیِ صبا ہے
جھکتی نظریں یہ بتا رہی ہیں
تُو میرے لیے بھی سوچتا ہے
مت مانگ دعائیں جب محبت
تیرا میرا معاملہ ہے

(احمد ندیم قاسمی)

چند لخت لخت اشعار دیکھیے:

ایک مدّت سے تیری یاد بھی نہ آئی ہمیں
اور ہم بُھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

(فراق)

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری راہگزر پھر بھی

(فراق)

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تُو نے تو خیر بےوفائی کی

(فراق)

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

(فراق)

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجیے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

(احمد ندیم قاسمی)

اے عشق ، میری تنہا بُھول
وقت آیا تری گواہی کا
(احمد ندیم قاسمی)

ترکِ محبت ، ترکِ تمنا کر چکنے کے بعد
اب یہ مشکل آن پڑی ہے کیسے بُھلائیں تمھیں
(ظہور نظر)

ترقی پسند غزل گو شعراء کے ایسے اشعار بہ کثرت مل جاتے ہیں، جو ضرب المثل بن گئے۔ درجہ اوّل کے شعراء کی تو بات ہی اور ہے، درجہ دوم کے شاعر محمد دین تاثیر کے دو اشعار دیکھیے:

داورِ حشر، مرا نامہ اعمال نہ پُوچھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
(محمد دین تاثیر)

حضورِ یار میں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
(محمد دین تاثیر)

نظم تھی، جو قلی قطب شاہ ، نظیر، حالی، اقبال سے جوش تک مُسمط کی مختلف النوع ہیئتوں: "مثلث، مخمس، مُسدس، مُربع، مُثمن، مُسبع، متسع اور مُعشر اور غزل فارم میں پابند نظم کی صورت لکھی جارہی تھی جس میں مغربی ہیئتوں، از قسم نظم معریٰ، نظمِ آزاد اور نثری نظم کی گنجائش موجود تھی، لیکن ابتداء میں غزل سے اجتناب کرتے ہوئے صرف پابند نظم لکھی گئی۔ ہَدَف طے تھا کہ مذہب کی رُوح سے نہیں، عقائد پرستانہ، عصبیت اور اُس سے پھوٹنے والی توہم پرستی سے اُلجھنا ہے۔ یہ ادبی محاذ اشتراکی معاشرے کے قیام اور حصولِ آزادی کا مُتمنی تھا اور امن کا پیامبر۔ لہٰذا ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی نظموں: "مزدور کا گیت"، "سرمایہ داری" اور "دہقان کا مُستقبل" اور سیّد مُطلبی فرید آبادی کی نظم: "ہیاہیا" طرز کی درانتی اور ہتھوڑا مار کہ نظمیں اور "اُٹھو، کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو، کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں" طرز کا مُروج رومانی لحن سے براہِ راست ٹکرا جانے والا جوش ملیح آبادی کا طنز سے لبریز لہجہ گھن گرج اور بُلند آہنگی دیکھنے کو ملی۔

تُو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ (مجاز)

چکی پیسو، روٹی کھاؤ
اپنی محنت کا پھل پاؤ
ہندو مسلم سب جُھوٹے ہیں
لا یخل ہیں یہ اُلجھاؤ

ان جھگڑوں میں مت آؤ
چکی پیسو، روٹی کھاؤ

(محمد دین تاثیر)

معین احسن جذبی نے روٹی کے ایک ٹکڑے کو "لاکھ ہلالوں سے حسین" قرار دیا اور جانثار اختر، گو، میخانے میں بیٹھے ہیں اور ساقی کو "گلرنگ جام" کی بجائے "لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم" اُٹھالانے کی فرمائش کرتے ہیں لیکن سب سے مزیدار بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے رُومانی شعراء سے کُھل کر چھیڑ چھاڑ بھی کی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی نظم: "اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام" سے مثال ملاحظہ ہو:

کِس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
رات دن نغمہ ہائے چنگ و رُباب
روز و شب گردشِ پیالہ و جام
ایک جانب رقیبِ بد کردار
ایک پہلو میں ساقیِ گلفام

(محمد دین تاثیر)

لیکن سب سے زیادہ ہاہاکار اُس وقت مچی، جب جوش ملیح آبادی نے اپنی نظموں میں اختر شیرانی کی عذرا، ریحانہ اور سلمٰی کے پہلو بہ پہلو مَیلی کچیلی جامن والی اور مہترانی کو لا بٹھایا۔

مہترانی ہو یا رانی، مُسکرائے گی ضرور (جوش)

ترسیل میں ناکامی سے بچنے کے لیے بیشتر ترقی پسند شعراء نے عام فہم علامات اور مُروج استعارات کو برتا۔ اُن میں فیض احمد فیض یوُں الگ دکھائی دیے کہ اُنھوں نے کئی ایک نئی تراکیب از قسم: شب گزیدہ سحر، دلِ زار، داغ داغ اُجالا اور آخرِ شب کے ہمسفر وضع کرنے کے ساتھ ساتھ قفس، ساقی، میکدہ، گلشن، خم، ساغر اور ناصح، بُلبل، مُحتسب اور صنم جیسی روایتی علامات کو از سرِ نو مانجھ کر اُجالا اور اُن میں معنویت اس طور پر پیدا کر دی کہ سیاست و رومانیت، عشق و انقلاب اور عصری حسیت جھلکے۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

("مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ": فیض احمد فیض)

جب کہ اُس دور کے بیشتر ترقی پسند شعراء کی نظموں کا غالب رجحان، جوش ملیح آبادی کے زیرِ اثر دہشت ناکی کی حدوں کو چُھوتی ہوئی خطابت اور گھن گرج ہے۔ بالخصوص سردار جعفری کی "بغاوت"، "مزدور لڑکیاں"، "جوانی" اور "جنگ و انقلاب" جیسی نظمیں:

بغاوت میرا مذہب ہے ، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خُدا میرا
بغاوت رسمِ چنگیزی سے، تہذیبِ تتاری سے
بغاوت جبر و اِستبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصرِ حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

(بغاوت: سردار جعفری)

ٹھوکروں پر اُن کے جھک جاتے ہیں دیوان و قصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
اُن کی چوٹوں سے نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں، اُلٹ ڈالیں بساطِ روزگار

(مزدور لڑکیاں: سردار جعفری)

نظم کا میلان مجاز لکھنوی، مخدوم محی الدین، یہاں تک کہ فیض احمد فیض کے ہاں بھی دیکھنے کو ملا:

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور درّاتے ہوئے
اِک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
سرکشی کی تُند آندھی دم بدم بڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف چڑھتی ہوئی

(انقلاب: مجاز)

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خود انسان سے حیوان بہت کھیل چُکا
مورِ بےجاں سے سُلیمان بہت کھیل چُکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دِگرگُوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

(موت کا گیت: مخدوم)

سب کاٹ دو بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو بے کل پھولوں کو
شانوں پہ بلکتے مت چھوڑو
(یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم: فیض احمد فیض)

یہ دیکھتے ہوئے سجّاد ظہیر نے جوش کے تصورِ انقلاب کی للکار سے بچ کر چلنے کی تلقین کی جس سے یہ لہر دبی تو ، لیکن وفورِ جذبات میں کمی نہ آئی۔ مخدوم محی الدین کی نظم: "اندھیرا" میں دوسری عالمی جنگ کی ہولناکی کا بیان اور نظم انقلاب میں انقلاب کی محبوبہ کے رُوپ میں تجسیم:

اے جانِ نغمہ، جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
(انقلاب: مخدوم محی الدین)

اور فیض کی نظم: "نثار میں تری گلیوں کے" میں محکوم ارضِ وطن کو محبوبہ کے روپ میں دیکھنا جذبات کے اُسی وفور کی امثال ہیں۔ لیکن خیر، فیض کی تو کلاس ہی اور ہے:

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی

خطابیہ لہجے اور وفورِ جذبات سے مُملو، راست اظہار سے بالواسطہ طرزِ اظہار کی طرف پیش قدمی کی پہلی مثال بھی فیض ہی کی نظم: "بُول کے لب آزاد ہیں تیرے" میں دیکھنے کو ملی جس کے ابتدائی حصّے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا بول کے جاں اب تک تیری ہے

کے بعد نظم بالواسطہ اظہار میں ڈھل کر Elevation کی سطح کو چُھو لیتی ہے۔ ایسے میں کئی ایک ترقی پسند شعراء نے مُسمط میں پابند نظم لکھتے ہوئے ہیئت کے تجربات کی معرفت اپنی شناخت وضع کرنے کا جتن کیا۔ مثال کے طور پر مُثلث کی ہیئت میں بہت پہلے نظام الدین میر ٹھی نے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں چھے مصرعوں کی مدحیہ نظم لکھی تھی۔

خوشی اک مشغلہ ہو رات دن کا　　شمار افزوں ہو اس کے سال و سن کا
خدا حافظ، خدا حافظ کوئن کا
کوئن دنیا کے ہر خطے میں نامی　　غریبوں اور مسکینوں کی حامی
خدا حافظ، خدا حافظ کوئن کا[۳]

اُسی ہیئت میں جانثار اختر کی نظم: "ابھی نہیں" ہے جب کہ مجاز لکھنوی نے اپنی مشہور نظم: "آوارہ" مُسمط کی ہیئتی صُورت مُربع میں لکھی:

شہر کی رات اور میں ناشادو ناکارہ پھرو　　جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے، کب تک دربہ در مارا پھروں　　اے غمِ دل کیا کروں؟ اے وحشتِ دل کیا کروں؟

اُس کے بعد مُربع ہی کی ہیئت میں قوافی کی ترتیب بدل بدل کر کیفی اعظمی نے نظم: "اندیشے"، جمیل مظہری نے "نوائے جَرس"، فراق نے "اے مادرِ ہند" اور سردار جعفری نے "وقت کا ترانہ لکھی" لیکن اُسی ہیئت میں اختر الایمان کی نظم: "پگڈنڈی" اور وامق جونپوری کی "بُھوکا ہے بنگال" یادگار ہیں۔ جب کہ وامق جونپوری نے تو مُربع میں مُستزاد اور ترجیع بند کا لُطف پیدا کر دیا۔

ندّی نالہ ، گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے کا اُلٹ گیا بَیو پار
مُٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال
رے ساتھی سستا ہے یہ مال
بُھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال

ماضی میں نظیر اکبر آبادی نے اپنی مشہور نظم: "بہار" میں مُخمس کی ہیئت برتی تھی۔

چمن میں آج نسیمِ بہار آپہنچی　　نویدِ نکہتِ گُل، بے شمار آپہنچی
صدائے قمری و صوت ہزار آپہنچی　　جُنوں کی فوج کی دل پر پکار، آپہنچی
ہزار شکر کہ فصلِ بہار آپہنچی

اُسی ہیئت میں قوافی کی تبدیلی کے ساتھ واجد علی شاہ اختر کی نظم: "رُخصت، اے اہلِ وطن" کہاں بُھولتی ہے۔ جس کا ٹیپ کا مصرع تھا: "رُخصت اے اہلِ وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں"۔ اب اُسی ہیئت میں اختر انصاری دہلوی نے "ڈھولک کا گیت"، سردار جعفری نے "امانتِ غم"، جانثار اختر اور کیفی اعظمی نے "گاندھی جناح ملاقات" کے

عنوان سے دو الگ الگ نظمیں لکھیں، لیکن اس ہیئت میں مُخمس معریٰ ترکیب بند کی صورت لکھی گئی کیفی اعظمی کی نظم: "بہروپنی" زبان زدِ خاص وعام ہوئی۔

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو　　جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیش سے چلی کم بخت　　ویسے، یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے

نیز مُخمس ہی میں ہر بند کا پانچواں مصرع، "مصرعِ ترجیع" بنا کر ساحر لُدھیانوی نے مشہور نظم "پرچھائیاں" لکھی، جو بعد ازاں اُن کے شعری مجموعے کا عنوان بنی۔

تم آرہی ہو زمانے سے جھینپتے ڈرتے　　نظر جُھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی　　خود اپنے سائے کی جُنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر　　ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے　　مری کھلی ہوئی بانہوں میں جُھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

(پرچھائیاں: ساحر)

مسمط کی تمام ہیئتوں میں سے مُسدس سب سے زیادہ مُستعمل رہی۔ اسی ہیئت کے سبب مرزا رفیع سودا کا کربلائی مرثیہ، "مرثیہ مُسدس" کہلایا اور ترکیب بند مُسدس کی نمایاں مثال حالی کی "مدوجزر اسلام" تھی لیکن جب ترقی پسندوں نے راندہ درگاہ نظیر اکبر آبادی کو نیا نیا اپنایا تو معلوم ہوا کہ اُسی ہیئت میں قدرے تبدیلی کے ساتھ نظیر نے اپنی مقبول نظم: "ہولی" لکھی تھی، جو مقبول ہوئی تو مُسدس میں اُسی آزادی کو برت کر مجاز لکھنوی نے نظم: "مہمان"، اختر انصاری دہلوی نے "ایک ستارہ" اور ساحر لدھیانوی نے دو نظمیں: "یہ کس کا لہو ہے؟" اور "جواہر لعل نہرو" لکھیں۔

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے　　زندگی منتظر ہے مُونہہ پھاڑے
زندگی خاک وخون میں لتھڑی　　آنکھ میں شعلہ ہائے تُند لیے
دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

(مہمان: مجاز)

جسم کی موت، کوئی موت نہیں ہوتی ہے　　جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رُکنے سے ارمان نہیں مر جاتے　　سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

(جوہر لعل نہرو: ساحر)

"جب کہ قطعہ کی ہیئت میں نظم لکھنے کا ایک کم یاب رُوپ احمد ندیم قاسمی کی کئی ایک نظموں: "دھڑکن"، "وحدت"، "محفلِ شب"، "نیلام" اور "پابندی" میں دیکھنے کو ملا۔ ان نظموں میں ہر شعر کا دوسرا مصرع، پہلے مصرعے سے آدھا ہے اور بہ قدر مُستزاد بڑھتا گیا ہے۔"(۴)

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی — راز کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں، تیری سیاست، فن میں — زہر کیوں گھولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مُقابل چڑیا — اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر — بُوند بھی بولتی ہے

(پابندی: ندیم)

پابند نظم میں ان تجربات کے بعد مغربی ہیئتوں پر بھی نظر اُٹھی۔ انگریزی میں بلینک ورس کے لیے بے قافیہ آئمبک پینٹا میٹر بحر مخصوص ہے، جسے دیکھتے ہوئے جانثار اختر نے عروضی آزادی کے ساتھ بے قافیہ نظمِ مُعریٰ "مہکتی ہوئی رات" لکھنے کا تجربہ کیا۔

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چُھپائے ترے دل کی دھڑکن
آج پھر تیری ادا سے مرے پاس آئی ہے
کتنے لمحے کہ غم زیست کے طوفانوں میں
زندگانی کی جلائے ہوئے باغی مشعل
تُو مرا عزمِ جواں بن کے مرے ساتھ رہی

تاہم جانثار اختر کی اس نظم کے تین، تین مصرعوں کے بند "معریٰ مُثلث" سے قریب تر ہیں۔ لیکن نظم معریٰ، صنف نہیں، محض ایک ہیئت ہے، جسے بیشتر ترقی پسند شعراء نے بڑے چاؤ کے ساتھ اپنایا۔ اُس سے اگلا قدم فرانسیسی شعری ہیئت "فری ورس" یعنی نظم آزاد کی طرف اُٹھنا تھا، جو نہیں اُٹھا۔ اردو میں نظم آزاد لکھنے کا تجربہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد، قیامِ برطانیہ کے دوران ۱۹۲۵ء میں کر چکے تھے۔

ترقی پسند شعراء نے ابتداء میں اس ہیئت سے اجتناب محض اس لیے نہیں کیا کہ اس خصوص میں غیر ترقی پسند: میراجی اور ن۔م راشد نمایاں ہو چلے تھے۔ ایک اہم وجہ اُس نامانوس ہیئت سے متعلق اُلجھاوے اور ابلاغ سے

متعلق معاملات تھے۔ یہی رویہ سانیٹ سے متعلق دیکھنے کو ملا، جسے رُومانی شاعر اختر شیرانی نے اردو میں متعارف کروادیا تھا، لیکن ترقی پسند شعراء نے قطعہ اور رُباعی جیسی مُروج اصناف کو سانیٹ پر ترجیح دی، نیز احمد ندیم قاسمی نے اردو میں پہلی بار ترائلے لکھنے کا تجربہ کر کے ہاتھ روک لیا۔

یہ دیکھتے ہوئے جب ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز نقاد ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے مغربی شعری ہیئتوں سے متعلق طویل مضمون لکھ کر الجھاوے دور کر دیے تو سلام مچھلی شہری، فیض اور اختر الایمان نے نظم آزاد کی نئی شعری ہیئت کو تمام تر تخلیقی امکانات کے ساتھ برت کر ماڈل فراہم کر دیا۔ بعد ازاں سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی اور وامق جونپوری نے بھی نظم معریٰ کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں لکھیں۔ سید مُطلبی فرید آبادی نے "پنہاری" کے عنوان سے اس نئی شعری ہیئت میں افسانہ لکھنے کی طرح ڈالی۔ عظیم قریشی، جہاں نظم آزاد میں مختصر ترین نظمیں لکھ کر نمایاں تھے، وہیں اُنھوں نے "بقائے دوام کے راہی" کے عنوان سے اس ہیئت میں اردو کی پہلی طویل نظم لکھی۔ اِس ہیئت میں کیا مخدوم محی الدین کی گیت نما نظم: "اک چنبیلی کے منڈوے تلے"، بُھول جانے کی چیز ہے؟

اسی طرح جب ۱۹۴۴ء کے رسالہ "خیال"، بمبئی میں میراجی کی چند نثری نظمیں بسنت سہائے کے قلمی نام سے "ادبی شہ پارے" اور "شعر منثور" کے عنوانات سے شائع ہوئیں تو ترقی پسند شعراء میں سے اختر الایمان پہلے شاعر تھے، جنھوں نے نثری نظم لکھنے کا تجربہ کیا۔ سجّاد ظہیر کی نثری نظمیں، جو "پگھلا نیلم" (۱۹۶۴ء) کا حصّہ ہیں قدرے بعد کی تخلیقات ہیں۔ سجّاد ظہیر کی نثری نظموں سے پہلے تو مشہور ترقی پسند نقاد ڈاکٹر محمد حسن کی کئی ایک نثری نظمیں شائع ہو چکی تھیں، جو اُن کے شعری مجموعے: "نغمۂ زنجیر" میں شامل ہیں۔

مُجمل طور پر ترقی پسند تحریک کے تین تو بلاشُبہ بڑے شاعر تھے، فراق، فیض اور اختر الایمان۔ لیکن معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری اور مخدوم محی الدین سے بھی Composite امیجری کے سبب تادیر اُمید وابستہ رہی پھر بھی:

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

(مجروح)

چشمِ نم مُسکراتی رہی رات بھر
آپ کی یاد آتی رہی رات بھر

(مخدوم)

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دُنیا، اب خواہشِ دُنیا کون کرے

(جذبی)

جیسی غزلیں اگر فلم میں نہ برتی جاتیں تو اوسط درجے ہی کی غزلیں تھیں۔

احمد راہی، جانثار اختر، قتیل شفائی اور کیفی اعظمی کی تو ساری شہرت اور مقبولیت فلمی گیت نگاری کے سبب ہے۔ غزل ہو یا نظم، اُن کے ہاں اوّل درجے کی تخلیقات آپ کو ملیں گی نہیں۔

ساحر لدھیانوی کی "آج کل"، دہلی ۱۹۴۳ء میں شائع ہونے والی نظم "تاج محل" ہو، نظم: "فرار" یا "چکلے"۔ حبیب جالب کی نظم "رقاصہ" ہو یا فلم میں برتی جانے والی غزل:

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں ، یہی بات بڑی بات ہے پیارے

سے ساحر اور جالب کو شہرت اور مقبولیت تو ارزاں ہوئی لیکن Content اور کرافٹ کے حوالے سے یہ درجہ دوم کی تخلیقات ہی شمار ہوں گی۔

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے نظم گو شعراء میں قُطبی ستارے کی طرح اس لیے بھی نمایاں ہیں کہ اُنھوں نے داخلی احساسات کی ترجمانی کی کامیاب ترسیل کے لیے استعاروں کی مدد سے ٹھوس حسی پیکر تراشنے کی بنا ڈالی۔ نظم: "یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم" میں اُمیدوں کی فصل، لہو کی کساد، بے آب بسمل پودوں کا سِسکنا اور شانوں پر سسکتے پودوں کی بے کلی، ٹھوس حسی پیکر تراشی کی چند صُورتیں تھیں۔ یہ پیکر تراشی، "ملاقات" اور "تنہائی" جیسی نظموں میں درجہِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

یہ رات اُس درد کا شجر ہے — جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم ہے کہ اس کی شانوں میں — لاکھوں مشعل بکف ستاروں کے
کارواں گھر کے کھو گئے ہیں — ہزار مہتاب اُس کے سائے میں
اپنا سب نُور روگئے ہیں — اُسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر — برس کے ہیرے پروگئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے — یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں، جو غم سے کریم تر ہے — سحر، جو شب سے عظیم تر ہے

(ملاقات: فیض احمد فیض)

نظم "ملاقات" میں قیدِ تنہائی کاٹتے ہوئے شاعر کا رات کو "درد کا شجر" کہہ کر رات کے حوالے سے ستارے، روشنی، شبنم اور نُور۔۔۔ جب کہ شجر کے حوالے سے شاخیں، سایہ اور زرد پتوں کے تلازمات لانا کوئی کھیل

نہیں۔ نیز، قیدِ تنہائی کی رات کو نہ ختم ہونے والی ظُلمت میں نہیں ڈھلنے دیا۔ نہ افسردگی کو نظم میں جگہ بنانے دی۔ اس نظم کے ساتھ فیض کی لازوال نظم "تنہائی" کو ملا کر پڑھنے سے شاعر کا جوہر مزید کُھلتا ہے۔ فیض کے بعد اگر نظر ٹِکتی ہے تو اختر الا یمان پر، جن کے شعری مجموعے: "تاریک سیارہ(۱۹۵۲ء)میں شامل نظمیں بالخصوص "ایک لڑکا" اور "پگڈنڈی" کا توجواب نہیں۔

غم دیدہ پس ماندہ راہی، تاریکی میں کھو جاتے ہیں — پاؤں راہ کے رُخساروں پر دُھندلے نقش بنا دیتے ہیں
آنے والے اور مُسافر پہلے نقش مِٹا دیتے ہیں — وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک افسانہ ہو جاتے ہیں
(پگڈنڈی: اختر الا یمان)

فیض کی نظموں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی یکجائی کی طرح اختر الا یمان کے ہاں ایک الگ ہی طرح کی کشمکش ہے۔ اس نوع کا تخلیقی تجربہ سردار جعفری ہی کیا، مجاز، ساحر، کیفی اعظمی اور جانثار اختر۔۔۔ کسی ایک کے ہاں بھی دکھائی نہیں دے گا۔ فیض کی نظم "رقیب سے" میں عہدِ گزشتہ کے رقیب کے لیے نرم گوشہ ہو یا اختر الا یمان کی نظم "پگڈنڈی" میں بے رحم وقت کا تصوّر اور لڑکی کی درماندگی۔۔ یہ Complex تخلیقی تجربہ جس نوع کی نفسی کیفیات کی ڈیمانڈ کرتا ہے، وہ ارزاں نہیں۔

فیض اور اختر الا یمان کو اس کا ادراک تھا کہ دل میں دردمندی کی رمق نہ رہی تو انسانی کردار ڈی ہیومنائز ہو کر بورژس پیسترناک کے Extremist بالشوِک کردار پاشا ہی میں ڈھلے گا۔ کٹھور، سنگدل لیکن کہلائے گا "مردِ آہن"۔

سوچتا ہوں، آج اگر ترقی پسندوں کے سُرخیل، علی سردار جعفری زندہ ہوتے تو یہ مضمون پڑھ کر مجھے بھی ڈپٹ دیتے۔ بالکل اُسی طرح، جیسے "گفتگو" کے صفحات پر یہ کہتے ہوئے دیوندر اِسر سے اُلجھ پڑے تھے کہ کامریڈ! تم تو یہ بات نہ کرو کہ انقلاب کی راہ پر چلتے ہوئے مینی فِسٹو کی پابند سنگدلی نپولیئن، ہٹلر اور اسٹالن کے کرداروں میں ڈھل جاتی ہے۔ نپولیئن اور ہٹلر سے اسٹالن کو الگ رکھو۔

> "غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کرنے والے سردار جعفری نے ایوانِ غزل سے
> اس لیے مُونہہ موڑ لیا تھا کہ غزل آشنا مزاج اور غزل کے آرائشی حصّے غمِ دہر سے
> رشتہ جوڑنے میں سدِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔"(۵)

جب کہ سردار جعفری نے مجاز کے اوّلین شعری مجموعے "آہنگ" ۱۹۳۸ء کو ترقی پسند تحریک کی پہلی شعری دستاویز قرار دیا تھا اور خُود رُومان کی پرچھائیں سے بچ کر خطابیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجاز ہی کے گہرے سائے سے بچنے کی کوشش کی۔ یُوں سردار جعفری کے لیے مجاز آخر دم تک ایک مشکل ہی بنے رہے۔ دوسری طرف مجاز کے

جیتے جی، فیض احمد فیض اور اختر الایمان اُسی رُومان کی پرچھائیں اور ترقی پسندانہ افکار کے امتزاج سے وہ لحن وضع کرنے میں کامیاب ہوئے، جو اگر مجاز بھی تادیر زندہ رہتے تو شاید وباید والی بات تھی۔

سردار جعفری کے لیے مجاز کے بعد فیض دوہری مشکل تھے، جس کے نتیجہ کے طور پر سردار جعفری نے اپنے لیے منتخب کردہ خطابیہ لحن کو بہر صورت بروئے کار لانے کی سعی کی اور خاطر خواہ نتائج کے استخراج میں ناکام رہے۔ اس لیے کہ سردار جعفری کی شاعرانہ استعداد کلاسیکی شعراء سے مخصوص "سہولتِ اظہار" سے بھی محروم تھی اور اُس "روایتی غنایت" سے بھی، جس کا کیمیائی عمل روزمرہ سے متعلق لفظیات کو بھی پُر اسرار معنوی اِبعاد سے دوچار کر دیتا ہے۔

سردار جعفری کا اپنے گردو پیش سے تعلق معروض اور موضوع سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ اپنے شعری تجربے میں فیض اور اختر الایمان کی طرح اکیلے بہت کم دکھائی دیے۔ اُنھیں تو ٹھاٹیں مارتے ہجوم سے مخاطب ہونے کا چاؤ تھا۔ تفصیلیہ اکثر اُن کی شاعری کا عیب بن جاتا ہے:

"ہم آج یلغار کر رہے ہیں"

بلاشبہ، بہت عمدہ لائن ہے اور اس میں اُن کا خطابیہ انداز بھی نبھ گیا، لیکن جب وہ کہتے ہیں: "ذلیل جنگوں کے مورچوں پر حیات کا وار کر رہے ہیں"، تو خطابیہ سے مخصوص وضاحت اور تفصیلیہ، شاعرانہ تہہ داری سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ کھڑی کھڑی اَصوات ہیں، از حد توانا اور پیچ و تاب کھاتی ہوئی، جو سردار جعفری کے آٹھ شعری مجموعوں: "پرواز"۱۹۴۴ء، "خون کی لکیر"۱۹۴۹ء، " نئی دنیا کو سلام"۱۹۴۹ء، "امن کا ستارہ"۱۹۵۰ء، "ایشیا جاگ اُٹھا"۱۹۵۰ء، "ایک خواب اور "۱۹۶۵ء، "پیراہن شرر"۱۹۶۶ء اور "لہو پکارتا ہے"۱۹۷۸ء میں اُنھیں جوش ملیح آبادی کی طرح "حمتائے حافظ شیراز" ثابت کرنے کے جتن کے علاوہ کچھ نہیں۔ اُن کا خطابیہ لے، پُر شور ہے لیکن اُس لے کا اکہرا پن کھلتا ہے۔ اُس میں تہہ داری نہیں۔ لفظیات کے پیچ پھلنے پھولنے والی راز داری نہیں۔ تاہم، اُن کے شعری مجموعے: "پتھر کی دیوار"۱۹۵۳ء جو اُن کی حبسیاتی شاعری پر مشتمل ہے، میں کہیں کہیں بلا کا تجرباتی اسلوب دیکھنے کو مِلا:

میں لکھ رہا ہوں
تمھاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے

"پتھر کی دیوار" ہی میں سردار جعفری کی ایک نظم ہے: "نیند"، جو راکھ کے ڈھیر میں چنگاری کی طرح دمکتی ہے۔

نیند ہے اک حسینہ

سُرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اُس کا سینہ
اُس کی پلکوں کے سایے میں خوابوں کی مدہوش پر چھائیاں کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار، دُکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بے زار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سُلا جا تی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے
پُھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری اُنگلیوں سے چھڑکتی ہے شبنم

اے کاش! سردار جعفری اس نظم کی آخری تین لائنیں قلم زد کر دیتے، تاکہ نظم میں موجود خُمار آلود شعری آہنگ آگے، اور آگے بڑھتا۔ وہ آخری تین لائنیں یہ ہیں:

اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بَخشتی ہے

اُس دور میں "پتھر کی دیوار" کے تجرباتی اسلوب سے لوگ چونکے بھی، لیکن سردار جعفری "نیند" جیسی نظم لکھ کر دوبارہ اُسی طرف نکل گئے۔ جہاں، جوش، وَلولہ، ہمہمہ سبھی کچھ تھا، لیکن غیر شخصی اور انفرادیت کی مہک سے خالی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سردار جعفری کی شاعری کا مواد صرف و محض پارٹی آرگن: "قومی جنگ"، بمبئی میں شائع ہونے والی خبروں کا خلاصہ ہے۔ یہ پُورا سچ نہ سہی لیکن حقیقت واقعہ سے قریب تر ہے۔

ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا سردار جعفری کے قریبی ترقی پسند مُعاصرین: فراق، فیض، ندیم، ظہیر کاشمیری، ظہور نظر اور سیف الدین سیف کے کیے دَھرے کو "Obscure Romanticism" کہیں گے؟ جیسا کہ سردار جعفری نے خیال کیا۔

اِکا دُکا صدائے زنجیر
زَنداں میں رات ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے
(فراق)

یہ جادو ہے، جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس ضمن میں اُس دور کے ترقی پسند تِھنک ٹینک کو قطعاً کوئی اُلجھاوانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے لٹریری آرگن: "سویرا" لاہور شمارہ ۱۷ میں ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مضمون: "انفرادی صلاحیت" کو مختار صدیقی سے ترجمہ کروا کر ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن اور ظہیر کاشمیری وغیرہ کے ذریعے زیرِ بحث لایا گیا تب بھی سردار جعفری نے ایلیٹ کا مضحکہ ہی اُڑایا۔ لیکن اُس سے بہت پہلے ۱۹۴۸ء میں سردار جعفری کی طویل نظم: "نئی دنیا کو سلام" کتابی صُورت میں شائع ہو چکی تھی، جس کے دوسرے حصّے: "زندگی کا ترانہ" کا آغاز اس لائن سے ہوتا ہے:

"یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے"

اُس کے ٹھیک بارہ برس بعد ساٹھ کے دہے میں محبوب خزاں، احمد مشتاق، منیر نیازی، ظفر اقبال اور شہریار کی صورت اردو غزل کو نیا لحن ملا، جسے نظرِ بد سے بچانے کی خاطر افتخار جالب کی لِسانی تشکیلات اُس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ستر کے دہے میں بہ زُعم خود جدید تر غزل گو شعراء نے مضحکہ خیزی کی آخری حدوں کو چُھو لیا۔ محض ایک مثال:

کیا مِلا اقبال ساجد جدتِ فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر دانتوں کا منجن بیچ کر
(اقبال ساجد)

اس کے ردِ عمل میں محمد خالد، شبیر شاہد، ثروت حسین، جمال احسانی، شاہدہ حسن، صابر ظفر، غلام حسین ماجد، سلیم کوثر، افضال احمد سیّد اور احمد جاوید نے بغیر کسی منصوبہ بندی کے، فرد فرد، اپنے تئیں غزل کی زندہ روایت کی بازیافت کا عمل شروع کیا تو خُدا جانے کیسے، اُن کے شعری تجربے میں علی سردار جعفری کی نظم: "نئی دنیا کو سلام" کی اُسی لائن:

"یہ آب و خاک وباد کا جہاں بہت حسین ہے "

کی گونج سُنائی دی۔ محمد خالد کا شعر ہے:

کبھی باد و آتشِ تیز میں ہے مری نمُو
کبھی خاک میں ، کبھی آب میں کبھی خواب میں

یُوں ستّر کے دہے میں سردار جعفری کے منتخب کردہ مُثبت عناصر: آب، خاک اور باد میں ایک منفی عنصر "آتش" اور ایک تخلیقی عنصر "خواب" کے اضافے نے صنفِ غزل کو بارِ دگر معدوم ہونے سے بچا لیا۔ اُس محدود تر غزل گوئی کی تحریک کے نظریہ ساز شاعر محمد خالد ہی کا شعر ہے:

خواب میں دُور سے آتی ہے کہیں کوئی صدا

سُنتے ہیں اور کیے جاتے ہیں روایت آگے

"محمد خالد کے انھی اشعار سے تحریک پا کر غلام حسین ساجد نے ۱۹۸۶ء میں مٹی، پانی، آگ، ہوا اور خواب سے متعلق دس دس غزلوں پر مشتمل پچاس غزلیات کا مجموعہ: "عناصر" تیار کر لیا۔"(۶)

ساجد کے ہاں آتش، صابر ظفر اور سلیم کوثر کے ہاں مٹی، جب کہ محمد خالد، شبیر شاہد اور شاہدہ حسن کے ہاں مٹی کے ساتھ خواب کا مطالعہ آسٹریالوجی کے حوالے سے بھی خاصا دلچسپ ہے۔

معلوم نہیں، یہ حقیقت ہے یا فسانہ کہ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کی سرد رات ڈھل چکی تھی، جب علی سردار جعفری کی زندگی کی سب سے بڑی مشکل، ڈبل نمونیہ کے شکار مجاز لکھنوی کو لال باغ، لکھنؤ کے ایک معمولی ہوٹل کی چھت پر سے ہسپتال منتقل کیا گیا، جہاں مجاز نے آخری سانس لیا تو اُن کے سرہانے اُن کی مداح طالب علم لڑکی اُداس بیٹھی تھی۔ جو مجاز کی محبوبہ کی ہم نام تھی۔ لیکن یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے کہ علی سردار جعفری کی نظم: "نئی دنیا کو سلام" کی ایک لائن تیس برس بعد ستّر کے دہے کے چیدہ غزل گو شعراء کے خواب سے مل کر اُسی مقہور و مردودِ صنف، غزل کی بازیافت کا باعث بنی، جسے سردار جعفری آخری دم تک رد کرتے رہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ کیا غزل کی اہمیت ختم ہو گئی، از حفیظ جالندھری، مشمولہ: نثرائے، مطبوعہ: مجلسِ اردو، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۶ء

۲۔ شاہراہ، دہلی، بابت جنوری ۱۹۵۶ء

۳۔ بحر الفصاحت، ص ۹۳

۴۔ نظم: دھڑکن اور وحدت، مجموعہ: جلال و جمال، محفل شب مجموعہ: دشتِ وفا اور نظم: نیلام، مجموعہ: محیط میں شامل ہیں۔

۵۔ سترہ برس کی عمر میں (۱۹۳۰ء) سردار جعفری نے غزل کا پہلا شعر کہا:

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

۶۔ میرے تحریر کردہ "عناصر" (از: غلام حسین ساجد) کے دیباچے پر ۱۹۸۶ء میں درج ہے۔ یہ کتاب بیکن بکس، ملتان سے شائع نہ ہو سکنے کے نتیجہ میں اور ٹینٹ پبلشرز، لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے آغاز میں محمد خالد کا شعر درج ہے:

کبھی باد و آتش تیز میں ہے مری نمو
کبھی خاک میں ، کبھی آب میں کبھی خواب میں

References in Roman Script:

1. Kya Ghazal ki ahmiyat khatam hogayi, az Hafeez ja Landhri, Mishmoola: nasraye, matboa : majlis e urdu, Lahore , taba awwal, 1976
2. Shahrah, Dehli , baabat January 1956
3. Behr al Fasahat, P, 93
4. nazam : dharkan aur wahdat, majmoa : jalal o jamal, mehfil e shab majmoa : dasht-e wafa aur nazam : nelaam, majmoa : muheet mein shaamil hain.
5. satrah baras ki Umar mein (1930) sir daar Jafferi ne ghazal ka pehla shair kaha :

   daman jhatak ke mnzl e gham se guzar gaya
   uth k dekhtii rahi gard e safar mujhe

6. meray tehreer kardah" anasir" (az : ghulam Hussain Sajid) ke debachay par 1986 mein darj hai. yeh kitaab bekon box, Multan se shaya nah hoskne ke nateeja mein aur tent publishers, Lahore se 1993 mein shaya hui. kitaab ke aaghaz mein Mohammad Khalid ka shair darj hai :

   kabhi baad o aatish taiz mein hai meri numoo
   kabhi khaak mein, kabhi aabb mein kabhi khawab mein

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.339

لی فانگ دا

پی ایچ ڈی سکالر، ایشیائی اور افریقی زبان وادب،

صدر شعبہ اردو، گوانگ ڈونگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز، گوانگزو، چین

ڈاکٹر یو آن یوہانگ

صدر شعبہ اردو، بیجنگ فارن سٹڈیز یونیورسٹی، بیجنگ، چین

چین میں اردو تدریس کی روایت کا تجزیہ*

Li Fangda
Doctoral Candidate in Asian-African Language and litreature,
Head of Urdu Department, Guangdong University of Foreign Studies, Guangzhou, China
Dr. Yuan Yuhang
Head of Urdu Department, Beijing Foreign Studies University, Beijing, China

Review on the Teaching of Urdu in China*

ABSTRACT

Pakistan is China's traditional friendly neighbor. As the official language of Pakistan, it is very important for mutual cooperation to get to know each other's language and culture and to give importance to the development of the language along with the construction of the China-Pakistan Economic Corridor. New strategies should be presented to develop a new era so that the training is improved to serve better the construction of CPEC. In the recent years, the universities in China have been rapidly establishing Urdu language departments. In this research paper the situation of Urdu teaching in China is analyzed and the promotion of Urdu teaching and its nature is discussed. It is observed that the training of Urdu talents needs further development. To understand better the educational system and history of the country is also covered.

Keywords: *China, Pakistan, Talents of uncommonly used language, Urdu Language, Language Education, Urdu Department*

*یہ آرٹیکل چین کے قومی سماجی سائنس پروجیکٹ "پاکستانی زبان کی تحریک اور چین پاکستان اقتصادی راہداری پر اس کے اثرات پر ایک مطالعہ" (21CGJ029) کی بنیاد پر تحریر کیا گیا ہے۔

Received: 12th Feb, 2023 | Accepted: 1st June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

۱۹۵۱ء سے اب تک چین پاک دوستی بڑی بڑی آزمائشوں سے گزری ہے اس کے باوجود دونوں ملکوں کے مابین دوستانہ تعلقات ابھی تک قائم و دائم ہیں۔ باہمی تعاون کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ ایک دوسرے کی زبان و ثقافت سے روشناس ہوا جائے اور چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر کے ساتھ ساتھ زبان کے فروغ کو بھی اہمیت دی جائے۔ پچھلے چند سالوں میں چین کی مختلف جامعات میں شعبۂ اردو کے قیام اور اس زبان کی تدریس میں کافی تیزی آئی ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں چین میں تدریسِ اردو کی صورتحال کا تجزیہ کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں چین کی مختلف جامعات میں تدریسِ اردو کے فروغ اور اس کی نوعیت و صورتحال کا بھی احاطہ کیا جائے گا۔

۱۔ چین میں تدریسِ اردو کی صورت حال

چین میں سب سے پہلا شعبۂ اردو ۱۹۶۴ء میں بیجنگ یونیورسٹی میں قائم ہوا۔ اور اب تک صرف اسی یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب میں ایم اے کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی بھی کروائی جارہی ہے۔ بعد میں چین کے وزیرِ تعلیم کی تجویز پر پچھلے دس سالوں میں چین کی مختلف جامعات میں اردو زبان و ادب کے شعبہ جات قائم کیے گئے، جن کا مقصد اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ پاک چین اقتصادی راہداری کا استحکام بھی ہے۔ اب تک ان کی تعداد دس سے زائد ہے۔ اگرچہ اردو کے ان شعبوں میں تدریسِ اردو کے معیار اور نصاب کی نوعیت میں کافی فرق ہے لیکن اس کے باوجود چین میں اردو زبان مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے دیکھیں تو بیشتر شعبۂ اردو چین کے مشرقی علاقے میں ہیں۔ پہلے پہل اردو بولنے والے اشخاص زیادہ تر سفارت خانے، میڈیا اور تدریسی اداروں میں کام کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ایسے محکمے اور ادارے جنہیں اردو بولنے والے افراد کی ضرورت ہے، بیشتر بیجنگ اور مشرقی علاقے میں ہیں۔ لیکن چین پاک اقتصادی راہداری کے منصوبے کی مسلسل ترقی کے ساتھ ساتھ چین کے مغربی صوبوں میں بھی اردو بولنے والے باصلاحیت افراد کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر چین پاکستان اقتصادی راہداری کی تعمیر میں صوبہ شن جانگ کو اہمیت حاصل ہے لیکن اس علاقے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں اردو زبان آتی ہے۔ زیادہ تر لوگ انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں، زبان کی اس رکاوٹ سے دونوں ملکوں کے مابین تعاون متاثر ہو رہا ہے جو تنازعات کا باعث بن رہا ہے[1]۔ اس حوالے سے چین میں اب کچھ منصوبہ بندی کی جارہی ہے جس کی وجہ سے ان تنازعات میں کمی آرہی ہے۔ صوبہ شن جانگ جیسے مغربی علاقے کو چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر میں اہم حیثیت حاصل ہے، اسی لیے وہاں زیادہ سے زیادہ شعبہ اردو قائم ہوتے جارہے ہیں۔

تدریسِ اردو اب صرف زبان سیکھنے اور سکھانے تک محدود نہیں رہی بلکہ پاکستان کی صورت حال، معاشرہ اور ثقافت وغیرہ سے آگاہی بھی طالب علموں کے لیے ممکن بنائی جارہی ہے۔ طالب علموں کو اردو اور انگریزی دونوں

زبانیں پڑھنی چاہئیں۔ان شعبوں کے کورس عام طور پر دو اقسام میں ہیں:ایک زبانی کورس ہے اور دوسرا ثقافتی کورس ہے۔اس مقالے میں چین کی تینوں جامعات، بیجنگ یونیورسٹی ، گوانگ ڈونگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز اور بیجنگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ بیجنگ یونیورسٹی میں خود پڑھنے اور بنیادی مطالعے کی قابلیت پر زیاہ توجہ دی جاتی ہے۔زبانی کورس کے علاوہ طالب علموں کو زیادہ تر ادبی،ثقافتی،مذہبی وغیرہ کے کورسز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ گوانگ ڈونگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں زبان کی مہارتیں سیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ طالبِ علم اردو اور انگریزی دونوں زبانیں اچھی طرح سیکھ سکیں۔اس لیے زیادہ تر انگریزی کورسز کا انتظام کیا گیا ہے۔اور زبان کے عملی معیار کو بہتر کرنے کے لیے زیادہ تر تراجم کرنے والے اداروں سے رابطے میں رہا جاتا ہے تاکہ طالب علم زبان کی مہارتوں کے ساتھ ساتھ ترجمے کا ہنر بھی سیکھ سکیں۔یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں بھی بین الاقوامی طالب علموں کی ترتیب کی جاتی ہے۔خاص طور پر چینی سفارتی ضرورت کے تحت پاکستان کی تاریخ، ثقافت اور سیاست کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔

شائع شدہ نصابی کتابوں کی تعداد اب تک بیس سے زائد ہیں،جو کئی اساتذہ کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔یہ کتابیں مختلف زبانی معلومات اور مہارتیں سیکھنے کے لیے ہیں،جیسے بنیادی اردو، چینی سے اردو یا اردو سے چینی ترجمہ، اردو چینی لغت وغیرہ۔لیکن عملی تدریس میں بھی کچھ نہ کچھ مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔سب سے پہلے،کچھ کتابوں کی دوبارہ اشاعت کی فوری ضرورت ہے۔خاص طور پر "بنیادی اردو" جو پانچ کتابیں ہیں،یہ چین میں واحد وسیع اور جامع کتابیں ہیں۔سب یونیورسٹیوں میں یہ کتابیں استعمال کی جارہی ہیں۔لیکن یہ بیس سال پہلے شائع ہوئی ہیں،ان میں کچھ قواعد اورالفاظ کا استعمال، موجودہ استعمال سے مختلف ہے۔اور کچھ مضامیں پرانے ہیں، جو معاشرتی ترقی کے معیارات اور ضروریات پوری نہیں کرسکتے ہیں۔یادوسرے لفظوں میں یہ مضامین ناکافی ہیں۔دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ مضامین زیادہ تر ادب کے بارے میں ہیں،سیاست،کاروبار،معیشت، ٹیکنالوجی کے بارے میں بہت کم ہیں۔اس لیے روزمرہ کی گفتگو کے دوران ابلاغ اور عملی ترجمے میں رکاوٹ پیش آرہی ہے۔ان کے علاوہ ان کتابوں کے موضوعات کچھ نہ کچھ محدود ہیں،مثال کے طور پر اب چین میں اردو سننے کے لیے کوئی خصوصی کتاب نہیں، چنانچہ طالب علموں کو اردو سننے کے معیار کو بلند کرنے میں بڑی مشکل درپیش ہے۔

۲-چین میں اردو زبان کی تعلیم کے اہم مسائل

اگرچہ چند سالوں سے چین میں اردو کی تعلیم میں بہت تیزی آئی ہے، لیکن اس کے باوجود اردو سیکھنے والے افراد کو چند مسائل کا سامنا ہے۔خاص طور پر چین پاک اقتصادی راہداری سے تدریسِ زبان کو نیا چیلنج پیش آیا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان کی تعلیم وتربیت میں بھی کچھ مسائل نکل کر سامنے آئے ہیں۔

سب سے پہلے پورے ملک میں شعبہ اردو کا قیام نامکمل ہے۔ ۲۰۱۵ء سے چین کے وزارت تعلیم نے شعبے کی تعمیر کا ذمہ صوبائی محکمہ کو دے دیا۔ چین پاک اقتصادی راہداری کی ترقی کے دوران، ملک بھر سے کئی یونیورسٹیوں نے درخواست پیش کی کہ وہ شعبہ اردو قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اس حوالے سے ان کا عزم بلند ہے، لیکن چینی طالب علموں کے لیے اردو سیکھنا، بولنا اور پڑھانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اردو سیکھنے کے لیے اگر کوئی طالبِ علم کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا خواہش مند ہو تو یونیورسٹی اُسے اس لحاظ سے مطمئن نہیں کر سکتی کہ وہاں طالب علموں کے لیے داخلے کے بعد کوئی مناسب استاد ہی موجود نہیں ہے۔ اس لیے اردو زبان سیکھنے کے لیے طالب علموں کو کسی دوسری یونیورسٹی میں بھیجنا پڑتا ہے جہاں زبان سیکھنے کا معیار اتنا اچھا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجموعی تدبیر کی کمی کی وجہ سے بھی زبان سیکھنے والے افراد کی ترتیب متاثر ہوتی ہے۔ زبان سیکھنے والے افراد کو شعبۂ اردو یا استاد کے نہ ہونے کی وجہ سے، وقت پر داخلہ نہیں ملتا اور جس کمپنی میں اردو بولنے والے افراد کی ضرورت ہو وہاں وہ وقت پر نہیں پہنچ پاتے یا کمپنی میں ملازمت کی اہلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سال میں زیادہ گریجوایٹ سامنے آتے ہیں تو کسی سال میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کی ملازمت اور کمپنی دونوں کو مشکلات معاشرے کے مطالبے کے مطابق وقت پر تبدیل نہیں کر سکتے، ہر یونیورسٹی کے طالب علموں کا اندراج الگ الگ ہے۔ اس لیے شاید کئی سال میں زیادہ گریجویٹ ہیں اور کئی سال میں کوئی نہیں، جس سے کمپنی میں طالب علموں کی ملازمت کے حصول اور کمپنی دونوں اطراف مشکلات پیش آتی ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اردو زبان کی ترتیب کا موجودہ نظام اور مقاصد واضح نہیں ہیں۔ جو چین پاک اقتصادی راہداری کے لیے زبان سیکھنے والے افراد کے لیے ضروری ہیں، اُنہیں نہ صرف اچھی طرح زبان استعمال کرنا آنا چاہیے، بلکہ معیشت، کاروبار، ٹیکنالوجی کے متعلقہ امور یا میدان میں معلومات بھی جاننا چاہئیں۔ اب چین کے شعبہ اردو میں زبان کے کورس کے سوا، بیشتر ثقافتی کورس ادب، مذہب یا تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ کچھ جنوبی ایشیائی مطالعہ اور پاکستانی مطالعہ کورس بھی موجود ہیں، لیکن ان میں چین پاک اقتصادی تعاون، جنوبی ایشیائی بین الاقوامی تعلقات، چین پاک سفارتی تعلقات سے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ اگرچہ کئی یونیوسٹیوں میں بھی ایسا نظام ہے جس سے طالب علم زبان اور دوسرے مضامین ایک ہی وقت میں پڑھ سکتے ہیں جیسے معیشت اور قانون وغیرہ۔ ایسے کورس میں زیادہ تر مطالعے کے مجموعی طریقے اور نظریے پڑھائے جاتے ہیں۔ پاکستان کی معیشت، قانون اور سیاست کے خاص معاملے کم شامل ہیں۔ اس نظام کے تحت طالب علم متوقع مقاصد سے تھوڑی دور ہو رہے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ شعبۂ اردو کے پوسٹ گریجویٹ کا نظام نامناسب ہے۔ حالیہ عرصے میں صرف بیجنگ یونیورسٹی میں مطالعۂ پاکستان اور جنوبی ایشیائی ادب و ثقافت کے میدان میں پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری موجو

ہے۔ اگرچہ شعبہ اردو کے طالب علم دوسرے مضامین بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن ماہر اساتذہ کی کمی سے ان کی توجہ مسلسل پاکستان سے دور ہو رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ بیشتر یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو کے استاد کا معیار اتنا بلند نہیں اس لیے ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری میں داخلہ ممکن نہیں۔ اس لیے یہ کلیدی مسئلہ ہے کہ کیسے تدریسِ اردو کے اساتذہ کا معیار بہتر بنایا جاسکتا ہے؟ اور اس کے ساتھ ساتھ پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کا نظام بہتر کیا جاسکتا ہے؟

۳-جدید دور میں اردو کی تعلیم کے لیے حکمت عملی اور امکانات

مذکورہ بالا مسائل کے حل کے لیے اس مقالے میں کچھ تجاویز ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

سب سے پہلے پاکستان کی موجودہ حقیقی صورت حال کے مطابق کورس کو ترتیب دیا جائے۔ پاکستان ایک اکثیر القومیتی ملک ہے جس میں مختلف زبانیں موجود ہیں۔ اردو قومی زبان کے طور پر ملک میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ ہر صوبے اور قوم کی اپنی اپنی مادری زبان ہے۔ اور ان صوبوں کے بیشتر عوام اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن ہر علاقے میں اپنی اپنی ثقافت پائی جاتی ہے۔ چین پاک اقتصادی راہداری کے اہم منصوبے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جہاں اردو اور چینی زبان بولنے والے افراد کی کمی ہے، جو ایک کلیدی مسئلہ ہے۔ یہ افراد "بیلٹ اینڈ روڈ" بنانے کے لیے بطور مترجم اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے افراد کو نہ صرف اس ملک کی اہم زبان جاننا چاہیے، بلکہ علاقائی زبان، یہاں تک کہ قومی اور قبائلی زبان سے بھی روشناس ہونا چاہیے۔[۲] موجودہ شعبۂ اردو کے کورس میں ایسی تجاویز پیش کی جائیں کہ طالب علم اردو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہندی بھی پڑھ سکیں۔ یہاں انتظامیہ کی جانب سے ایسی تجاویز پیش کرنا چاہیے کہ اردو اور انگریزی پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہر یونیورسٹی میں اپنے پاکستانی ماہر اساتذہ سے فائدہ اٹھا کر ہندی کے علاوہ ایک اور پاکستانی علاقائی زبان پڑھائی جاسکے تاکہ طالب علم اس زبان سے متعلق علاقائی ثقافت، تاریخ اور رسم ورواج بھی سمجھ سکیں۔ اس طرح نہ صرف اقتصادی پروگرام کی تعمیر کرنے کے دوران زبانی کی تعلیم کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، بلکہ چینی اور علاقائی عوام کے درمیان گفتگو کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔

حالیہ سال زیادہ یونیورسٹیوں میں اردو چینی زبان کی تعلیم کے لیے ایسا نظام قائم کرنے کی جستجو کی جارہی ہے جس کے نصاب میں "غیر معمولی زبان + عوامی زبان" یا "غیر معمولی زبان + دوسرے غیر زبان کے مضامین" شامل ہے۔ شعبہ اردو کے لیے بہتر یہ ہے کہ پاکستان کی بنیادی صورت حال اور زبان کے تعلیمی ماحول کی بنا پر یہ نظام قائم ہو۔ مثال کے طور پر پاکستان کی سرکاری زبانیں انگریزی اور اردو ہیں۔ اسی وجہ سے "اردو + انگریزی" کی جامع تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ طالب علموں کی زبان بولنے اور سمجھنے کی مہارتیں اعلیٰ قابلیت کی حامل ہو سکیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ "غیر معمولی زبان + دوسرے غیر زبان کے مضامین" کے تحت میڈیا، بین الاقوامی تعلقات، تاریخ، کاروبار، معیشت جیسے مضامین کے کورس سیکھائے جائیں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ ملک کی ضرورت، طالب علموں کی اپنی ترقی، غیر ملکی زبان پڑھنے کا اصول ان تینوں کے آپس میں تعلقات کو مربوط کیا جائے۔[۳] ملکی اور سماجی سطح پر جن ملکوں نے چین سے سرکاری تعلقات رکھے ہیں، چین میں ان ملکوں کی سرکاری زبانیں جاننے والے افراد کا موجود ہونا ضروری ہے۔ طالب علموں کی اپنی ترقی کے لیے یہ بہتر ہے کہ اردو زبان کی غیر معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہتر مواقع اور مستحکم ترقیاتی منصوبے حاصل کر سکیں۔ اور وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس زبان کے علاوہ بھی کوئی اور معلومات مزید پڑھ سکیں۔ غیر ملکی زبان پڑھنے کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کام کے دوران غیر ملکی زبان بولنے کے قابل ہونا ہے تو غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے دو ہزار سے زائد گھنٹے اس کی تعلیم حاصل کی جائے، جو لازمی "کریڈٹ آورز" ہیں۔[۴] کسی طریقے سے ان تینوں اصولوں یا تجاویز کو مربوط کیا جائے، جو کہ فی الحال منظم نہیں ہیں۔ اور یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ شعبہ اردو کی طرف سے یہ مسائل حل ہونے چاہئیں۔ اردو زبان کی تعلیم کے حوالے سے کچھ اصول حسبِ ذیل ہیں:

چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر کے لیے نہ صرف اردو اشخاص ضروری ہیں، بلکہ پاکستان کی دوسری علاقائی زبان بولنے والے اور دیگر علاقائی معلومات رکھنے والے اشخاص بھی ضروری ہیں۔ طالب علم کے لیے کیونکہ اردو ایک غیر معمولی زبان ہے، لیکن روزمرہ کی بول چال کے لیے اتنی وسیع زبان نہیں ہے، یعنی انگریزی، عربی، روسی وغیرہ سے زیادہ وسیع نہیں۔ خاص طور پر راہداری کے راستے میں کچھ علاقے ایسے آتے ہیں جو نسبتاً غریب اور وسائل سے محروم ہیں اور اسی طرح وہ اردو کے بجائے اپنی علاقائی زبان بولنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ طالب علم ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ کام ڈھونڈنے میں زیادہ اور وسیع مواقع ملیں، اس طرح وہ زبان سیکھنے میں سنجیدگی اور محنت سے کام لیتے ہیں۔ اردو ایک غیر معمولی زبان ہونے کی وجہ سے، اس کا لکھنا، قواعد، تلفظ وغیرہ چینی، انگریزی سے بہت مختلف اور مشکل ہے۔ لمبے عرصے کی ترتیب و تعلیم سے ہی اچھی طرح سیکھا جا سکتا ہے۔ ان مذکورہ اصولوں کے لیے تین تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں: سب سے پہلے، حکومت اور یونیورسٹی اپنے علاقے کی ضرورت اور اپنی یونیورسٹی کے معیار کے مطابق کورس / نصاب مرتب کرے۔ مثلاً گوانگ ڈونگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز کاروبار اور معیشت پر زیادہ توجہ دے، اور اسی حساب سے کورس ترتیب دے۔ اور بیجنگ یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز سفارت اور سیاست پر زیادہ توجہ دے، اور اسی حساب سے کورس ترتیب دے۔ دوسرا یہ ہے کہ اردو اور پاکستان کی قومی زبانوں میں اتنا زیادہ فرق نہیں، یہ ممکن ہے کہ طالب علم گریجوایشن کے دوران دو مشابہ زبانیں پڑھ سکیں۔ اس لیے یونیورسٹی ایسا جامع نصاب ترتیب دے جس میں اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانیں بھی شامل ہوں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر کے دوران زبان کی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد بنیادی طور پر اردو زبان کی مہارتوں کی تعلیم کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: تحقیق پر مبنی اور عملی۔ زبان کی یہ تعلیمی

تقسیم عملی صلاحیتوں کو دو طرفہ تعاون کے مخصوص منصوبوں میں بروئے کار لانے کے لیے ناکافی ہے۔ چین میں زبان کی تعلیم کے ماہر ون قیو فانگ نے "بیلٹ اینڈ روڈ" کی تعمیراتی ضروریات کو مندرجہ ذیل چار زمروں میں تقسیم کیا ہے:۱- بین الحکومتی عوام اور ثقافت کے تبادلے؛۲- منصوبے کی فیصلہ سازی اور مذاکرات؛۳- پروجیکٹ بیرون ملک میں انجام دینا؛۴- پروجیکٹ اپنے ملک میں انجام دینا۔ اس سے چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر کے لیے درکار صلاحیتوں کے لئے مندرجہ ذیل تربیتی راستے نکالے جاسکتے ہیں۔

تحقیق پر مبنی صلاحیتیں: بنیادی اردو انڈر گریجویٹ + مختلف شعبوں (انڈر گریجویٹ سطح پر اردو زبان پڑھنے کے ساتھ ساتھ، اردو زبان سیکھنے کی صلاحیتوں کے لیے پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کروائی جائے اور اس کے لیے پاکستان کی پشتو، بلوچی، پنجابی، سندھی اور دیگر مقامی زبانوں کے علاوہ ہندی، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کو نصاب کا حصہ بنایا جائے جو تحقیق کے لیے سازگار ثابت ہو)؛ غیر لسانی شعبہ + اردو (انڈر گریجویٹ سطح پر غیر زبان پیشہ ور افراد کے لیے اور پوسٹ گریجویٹ مطالعاتی مرحلے کے لیے اردو زبان کی مہارتیں سکھائی جائیں اور پھر ان کی عملی صورتوں کی ضمانت ہونی چاہیے)۔

عملی صلاحیتیں:۱- بیچلر + ماسٹرز کی ڈگری: اس قسم کی تعلیمی مہارت کا بنیادی مقصد اعلیٰ سطحی بین الحکومتی تبادلے، پروجیکٹ کی فیصلہ سازی اور مذاکرات کے دوران تبادلۂ خیال کے قابل ہونا ہے۔ اس میں دو حصے لازمی ہیں: زبان سیکھنے والے افراد پاکستان اور جنوبی ایشیا کی صورتِ حال سے روشناس ہوتے ہیں یا ایک خصوصی صنعتی صورتحال سے روشناس ہوتے ہیں۔ بہتر طالب علم اردو اور کئی متعلقہ شعبوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں مثلاً سماجیات، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔ ۲- بیچلر کی ڈگری: اس میں بنیادی اردو کی تعلیم دی جائے جو کاروبار اور خبروں کی اشاعت کے لیے، اقتصادی اور جرنلزم کے شعبے کے لیے یہ تعلیمی مہارت مددگار ثابت ہو۔

ان یونیورسٹیوں میں، تھنک ٹینک ریسرچ، بین الحکومتی عوام اور ثقافت کے تبادلے، پروجیکٹ کے لیے فیصلہ سازی اور مذاکرات، قومی بنیادی مفادات اور اہم فیصلوں پر مشتمل دیگر صلاحیتوں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ پاکستانی معاشرے، تاریخ اور ثقافت میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اردو، انگریزی کو سمجھنے اور پاکستان کی مقامی زبان کو نصاب کا حصہ بنانے کی شرائط رکھنے کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ چین پاکستان اقتصادی راہداری اور "بیلٹ اینڈ روڈ" کی تعمیر کے دوران بھی غیر زبان افراد کو زبان سیکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ افراد "اردو انڈر گریجویٹ میجر + مختلف شعبوں کا علم "(۵/۶ کورسز) یا "غیر زبان کی تعلیم انڈر گریجویٹ میجرز + اردو" (۱۰۰۰ گھنٹے کی گہری تربیت سے کم نہیں) ہو سکتی ہیں۔

چوتھی تجویز ہے کہ اردو کی غیر پیشہ ورانہ تعلیم کو بہتر بنانا:۔ پیشہ ورانہ غیر ملکی زبان کی تعلیم ظاہر ہے کہ "بیلٹ اینڈ روڈ" کے لیے زبان کی تعلیم افراد کی تربیت کی بنیادی طاقت ہے، لیکن جب غیر معمولی زبانوں کے افراد کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہیں، تو "بہت محدود ہے، کام کا عرصہ طویل ہے، اور ایک یونٹ کے وقت میں کام کرنے والے افراد کی تعداد نسبتاً محدود ہے۔ مستقبل کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، خاص طور پر مخصوص زبانوں کی تعلیم کی ضرورت کا مشکل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے"۔[۵] کچھ غیر ملکی کاروباری افراد کا متعلقہ اداروں سے فوری مطالبہ پیشہ ورانہ اردو صلاحیتوں کا نہیں ہے بلکہ روزمرہ زندگی میں کاروباری مذاکرات اور دیگر پہلوؤں کے لیے غیر ملکی زبان کی تربیت کا ہے جو متعلقہ کاروباری مہارت رکھتے ہیں یا متعلقہ کام کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لیے غیر پیشہ ورانہ اردو تعلیم کو بھی چین پاک اقتصادی راہداری کی تعمیر کے تحت زبان کی تعلیم کو افراد کی تربیت کا اہم حصہ بننا چاہیے۔ اس وقت اردو کی غیر پیشہ ورانہ تعلیم نسبتاً شروع نہیں ہوئی اور اردو میجرز (بنیادی اردو) پیش کرنے والے ادارے شاذ و نادر ہی زبان کی تعلیم و تربیت جیسے مختصر کورسز فراہم کرتے ہیں۔ زبان سیکھنے والے افراد دستیاب نصابی کتابوں کے ذریعے خود اردو سیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے موجودہ نصابی کتابیں شاذ و نادر ہی آڈیو ڈسک سے لیس ہوتی ہیں اور اسباق کی مشق کے لیے جوابات فراہم بھی نہیں کرتی ہیں۔ خود سیکھنے والوں کے لیے موجودہ نصابی کتابوں کے ذریعے اردو تلفظ سیکھنا، اس میں مہارت حاصل کرنا اور زبان کا صحیح اظہار سیکھنا مشکل ہے۔ مستقبل میں غیر پیشہ ورانہ اردو تعلیم کی تعمیر میں کالج اور یونیورسٹیاں جدید ہائی ٹیک پلیٹ فارم کو استعمال کر کے مزید آن لائن کورسز تیار کریں تاکہ تعلیمی اور تدریسی وسائل کا اشتراک ممکن ہو سکے۔

اس ساری بحث کے اجمال میں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ چین پاک اقتصادی راہداری کے تعمیراتی منصوبے کے ساتھ ساتھ اردو زبان نے ایک اہم تزویراتی زبان (Strategic Language) کے طور پر رفتہ رفتہ زندگی کے ہر شعبے کے وسیع پیمانے پر توجہ حاصل کی ہے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو درس و تدریس میں بھی ترقی کے نئے مواقع پیدا کیے گئے ہیں۔ اگرچہ چین کی اردو ٹیلنٹ ٹریننگ کی ایک نسبتاً طویل تاریخی روایت ہے، لیکن "بیلٹ اینڈ روڈ" کے آغاز کے تناظر میں یہ کیسے یقینی بنایا جائے کہ اردو تعلیم کے روایتی فوائد کو عملی جامہ پہنایا جانے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق بھی بنایا جائے تاکہ قومی زبان کی حکمت عملی کی ضروریات کو پورا کیا جائے اور اعلیٰ معیار کی اردو صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جاسکے۔ معاشرے کے تمام شعبوں، یونیورسٹیوں کے متعلقہ محکموں اور اردو اساتذہ کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کے ٹیلنٹ ٹریننگ ماڈل کو مزید بہتر بنائیں، تعلیمی وسائل کو مربوط کریں، تاکہ چین میں غیر ملکی زبان کی تعلیم کو فروغ ملے اور ترقی کے میدان میں زیادہ سے زیادہ خدمات سرانجام دی جاسکیں۔

حوالہ جات

1. Li Yahui. Urdu Language Education in Xinjiang under the Background of CPEC Development. South Asian Studies Quarterly. 2016(03) Page:96-100+6.
2. ZHAO Shi-ju. Language needs for the construction of “The Belt and Road Initiative” and its services. Journal of Yunnan Normal University (Humanities and Social Sciences). 2015(04) Page:36-42.
3. Wen Qiufang. Producing Language-qualified Personnel for “the Belt and Road Initiatives”. Chinese Journal of Language Policy and Planning. 2016(02) Page:26-32.
4. Conway, John. Civilian language education in America: how the Air Force and academia can thrive together. AIR UNIV MAXWELL AFB AL AIR FORCE RESEARCH INST, 2010.
5. Li Jia. From the perspective of the language demand of the 'Belt and Road' to review the problems of non-professional foreign language education. Selected from “Language Service and One Belt and One Road”, edited by Zhao Shiju, Huang Nanjin. Social sciences academic press(CHINA), 2016.

References in Roman Script:

1. Li Yahui. Urdu Language Education in Xinjiang under the Background of CPEC Development. South Asian Studies Quarterly. 2016(03) Page:96-100+6.
2. ZHAO Shi-ju. Language needs for the construction of “The Belt and Road Initiative” and its services. Journal of Yunnan Normal University (Humanities and Social Sciences). 2015(04) Page:36-42.
3. Wen Qiufang. Producing Language-qualified Personnel for “the Belt and Road Initiatives”. Chinese Journal of Language Policy and Planning. 2016(02) Page:26-32.
4. Conway, John. Civilian language education in America: how the Air Force and academia can thrive together. AIR UNIV MAXWELL AFB AL AIR FORCE RESEARCH INST, 2010.
5. Li Jia. From the perspective of the language demand of the 'Belt and Road' to review the problems of non-professional foreign language education. Selected from “Language Service and One Belt and One Road”, edited by Zhao Shiju, Huang Nanjin. Social sciences academic press(CHINA), 2016.

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.287

ڈاکٹر محمد حامد
صدرِ شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج زروبی، صوابی
ڈاکٹر سلمیٰ اسلم
لیکچرار اردو، ہوم اکنامکس کالج، جامعہ پشاور

اردو تحقیق میں 'نمونہ بندی' کی تکنیک کا استعمال: ایک جائزہ

Dr. Muhammad Hamid
Head Department of Urdu, Govt. College Zarobi, Sawabi.
Dr. Salma Aslam
Lecturer Urdu, Govt. Home Economics College, University of Peshawar.

Use of 'Sampling' Technique in Urdu Research: An Analysis

ABSTRACT

Sampling is an important technique used in the modern research in social sciences. The technique covers a large kinds of research with ease. Its main kinds are probability and non-probability sampling, and both are used in research to draw reliable and trustworthy results. Sampling is used in literary and historical research too. The sub-techniques of non-probability sampling like purposive sampling, convenience sampling, judgement sampling have been used in Urdu research, but no researcher uses the term 'sampling' in their research report. Several researchers clearly describe their research methodology in dissertations, still they do not mention sampling, despite the use of it in the research. A good hand on the use of sampling is need of the modern research, so it should be included in the curriculum of research methodology in universities. This article is based on the study of 50 theses, which secured through systematic random sampling. The findings have been drawn from the samples and applied on the whole types. Conclusion has been presented based on findings.

Keywords: *Research Methodology, Sampling, Probability Sampling, Non-Probability Sampling, Purposive Sampling, Convenience Sampling, Judgement Sampling.*

جدید دور تحقیق کا دور ہے۔ سیارہ زمین پر زندگی روز بروز تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ ہر شعبۂ علم مسلسل ترقی وارتقا کی جانب گامزن ہے۔ نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں۔ زمین و کائنات کا ہر ہر گوشہ کھنگالا جارہا ہے۔ آفاق کے علاوہ انفُس کی دنیا میں بھی دریافتیں کی جارہی ہیں۔ انسانی عقل و شعور کے ڈانڈے افلاک سے ملتے جارہے ہیں۔

Received: 11thFeb, 2023 | Accepted: 5th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

کائنات کی وسعتیں انسانی تگ و تاز کی زد میں ہیں تو انسانی اندرون کی گہرائیاں بھی اس کی دسترس سے دور نہیں رہیں۔ سائنس اور سائنسی منہاج (Scientific Method) نے علم اور تلاش کے طریقوں میں معروضیت اور تجربیت کی خوبیاں پیدا کیں۔ اب فطرت کا ہر مظہر بار بار کھوج اور تلاش کے مراحل سے گزارا جارہا ہے اور نئی معلومات اور مفاہیم کے در وا کیے جارہے ہیں۔ اب کوئی بھی شعبہ شجرِ ممنوعہ نہیں رہا۔ تجربیت اور معروضیت کا اطلاق ہر مبحث اور مظہر پر کیا جارہا ہے اور قابلِ توثیق نتائج حاصل کیے جارہے ہیں۔

تحقیق کا یہ انداز و طریق صرف سائنس و ٹیکنالوجی تک محدود نہیں رہا۔ سماجی علوم بھی سائنسی طریقے کی زد میں آرہے ہیں۔ یہاں بھی توثیق و اعادہ کو اہمیت دی جارہی ہے۔ ادبی تحقیقات بھی ان تبدیلیوں سے دور نہیں رہ سکتیں۔ ادب میں بھی نئے مباحث اٹھائے جارہے ہیں اور تحقیق کے جدید طریقوں کا استعمال رواج پا رہا ہے۔ موضوعیت، اندازہ، قیاس، تاثر و وجدان کو چھوڑا جارہا ہے اور تجربیت و عملیت کو اہمیت دی جارہی ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی کے الفاظ میں:

> تحقیق کا طریقِ کار بڑا منظم ہوتا ہے۔ محقق کی نگاہ ان تمام تحقیقات پر ہوتی ہے جو اس وقت تک اس شعبے (موضوع) میں ہو چکی ہوں۔ (یعنی اس کا ڈیزائن واضح ہوتا ہے)۔ اسے صحیح طور پر علم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز کہاں سے ہوگا، اس کی منزل کیا ہے، اور سارے سفر میں وہ کون سا موزوں طریقِ کار اختیار کرے کہ اپنی منزل تک پہنچ سکے؟ اس مقصد کے لیے وہ موزوں ذرائع، درست مشاہدات اور قابلِ اعتماد آلاتِ تحقیق استعمال کرتا ہے۔[1]

بجا کہ تنقید و تخلیق میں موضوعیت، وجدان و تاثر سے مفر ممکن نہیں، لیکن تحقیق میں اگر یہ عناصر آجائیں تو تحقیق کے نتائج ناقابلِ توثیق اور محض ذاتی بن جاتے ہیں جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

دورِ موجود میں جامعات قابلِ اعتماد تحقیق کے کارخانے ہیں جہاں اقوام و ممالک کی ترقی و کامیابی کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں۔ جامعات اپنے معاشروں کو ایک طرف سائنسی ایجادات دے رہی ہیں جس سے ان کی جسمانی سہولتیں بڑھ رہی ہیں۔ دوسری طرف سماجی علوم و رویوں کی تحقیقات انسان کی شعوری اور جذباتی خصائص میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر رہی ہیں۔ سماجی علوم میں ایک توانا اور مؤثر شعبہ ادب کا بھی ہے جو انسانی معاشرے کی عکاسی کر کے خوب تر معاشرے کے قیام کے لیے فضا سازی کرتا ہے۔ ادبیات کے شعبوں کی تحقیقات نہ صرف ادب اور انسان کے تعلق کو واضح کرتی ہیں بلکہ ان کے ایک دوسرے پر اثرات اور ادب کی اثر پذیری و تاثیر پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

پاکستانی جامعات میں بھی ادبیات کے شعبے تحقیقات کروا رہے ہیں۔ ان تحقیقات کی بنیاد پر تحقیق کاروں کو ایم فِل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں جاری کی جا رہی ہیں۔ لیکن ان تحقیقی کاموں کی اہمیت، وقعت اور تاثیر کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کے نتائج کس حد تک قابلِ اعتماد اور قابلِ توثیق ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تحقیق کی بنیاد اگر قیاسات، اندازوں یا تاثر پر ہو تو اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کے نتائج تبھی قابلِ اعتماد قرار دیے جاتے ہیں جب اس میں سائنسی طریقِ کار استعمال کیا گیا ہو اور اس کا ہر قدم کھلا، واضح اور درست ہو۔

پاکستان میں اردو ادبی و لسانی تحقیق ملک کے وجود میں آنے سے پہلے سے جاری ہے۔ جس طرح باقی دنیا میں تحقیق کے طریقوں میں تبدیلیاں آتی رہیں، پاکستان میں بھی ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ تحقیقی طریقِ کار پر اردو تحقیق کاروں اور اساتذہ کے متعدد مقالات سامنے آئے جن میں تحقیق کے عمل کو زیادہ بامعنی اور قابلِ اعتماد بنانے پر توجہ دی گئی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر عطش درانی کی تصانیف خصوصی حوالے کے قابل ہیں جن کے ذریعے اردو تحقیق کاروں کو منظم اور سائنسی طریق پر تحقیق کے طریقوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی۔ اردو زبان و ادب میں تحقیقی طریقِ کار سمجھانے کے لیے گیان چند کی تحقیق کا فن، تبسم کاشمیری کی "ادبی تحقیق کے اصول" اور ایم سلطانہ بخش کی مرتبہ کتاب "اردو میں اصولِ تحقیق" بطور خاص مقبولیت رکھتے ہیں۔ عطش درانی کی کتب سائنسی طرزِ تحقیق پر زیادہ توجہ دلاتی ہیں لیکن جامعات کے شعبہ ہائے اردو میں ان کی کتب بوجوہ زیادہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکیں۔ اردو تحقیق کاروں کو معروضی و سائنسی اندازِ تحقیق کی طرف راغب کرنے کے لیے ان کی تصنیفات و تالیفات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

زیرِ نظر مقالے کی تیاری میں تحقیق کا فن (۲۰۰۲ء)، اصولِ ادبی تحقیق (۲۰۱۱ء)، لسانی و ادبی تحقیق (۲۰۱۶ء)، اردو تحقیق (۲۰۰۳ء)، اردو میں اصولِ تحقیق (۲۰۱۲ء)، اصولِ تحقیق (۲۰۱۵ء)، ادبی تحقیق کے اصول (۲۰۲۰ء)، تحقیق و تدوین کا طریقہ کار (۲۰۱۲ء) و دیگر کتب سے مدد لی گئی ہے۔ یہ کتب اردو میں تدریسِ تحقیق کی بنیادی کتب ہیں اور ان میں تاریخی و دستاویزی تحقیق کے علاوہ بیانیہ تحقیق کے طریقِ کار پر بھی اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ اردو تحقیق کا زیادہ رجحان تاریخی / دستاویزی تحقیق کی طرف ہے اس لیے ان کتب میں بھی اسی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اردو تحقیق کی روایت میں جن بزرگوں کی کاوشیں نقشِ اولین پیش کرتی ہیں وہ تحقیق کے میدان میں اپنی طبیعت اور میلان کی وجہ سے داخل ہوئے تھے۔ وہ تحقیق کے لیے باضابطہ تربیت یافتہ نہیں تھے لیکن پھر بھی ان کی تحقیقات اعلیٰ معیار کی حامل ہیں۔ اب چونکہ دنیا کا منظر نامہ بدل رہا ہے اور ہر چیز کو خاص اصول و ضوابط کے مطابق بنایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تحقیق کو بھی ایک علمی ڈسپلن کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ "اب دنیا کسی تحقیق کو صرف اس وقت تحقیق مانتی ہے جب وہ کسی تحقیقی طریقے اور ڈیزائن کے مطابق معروضی ہو۔ اگر تحقیقی اصولوں کے بغیر کوئی مقالہ

پیش کیا جائے گا تو وہ خواہ کتنا ہی بڑے علمی مقام کا حامل ہو، تحقیقی قرار نہیں پا سکتا"۔[۲] اس لیے اب محقق کو تحقیق کے میدان میں اتارنے سے پہلے اصول و ضوابط کے علم اور عملی تربیت کے مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ لیکن اگر اردو تحقیق کے ذخیرے پر نظر ڈالی جائے تو اس میں اب بھی روایتی انداز حاوی نظر آتا ہے۔ چونکہ اس میں بہتری کی خاصی گنجائش بھی موجود ہے اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگی بھی ضروری ہے، اس لیے اس میں تبدیلی و بہتری لابُدی ہے۔ اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال پر ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے یہ الفاظ صحیح دلالت کرتے ہیں:

> اِس وقت اردو میں تحقیق کا جو مفہوم رائج یا تحقیق کے جو پیراڈائم کارفرما ہیں، یہ عمرانی، ثقافتی اور فلسفیانہ سوالات کی دستک تک سننے کے روادار نہیں۔ دوسرے لفظوں میں "رائج اردو تحقیق" اپنے حال میں مست ہے۔ یہ کیفیت 'اپنی نظر' سے یا کسی دوسرے کی نظر سے، خود کو آنکنے اور خود آگاہ ہونے کے عمل سے سرد مہری کی حد تک لاتعلق ہوتی ہے۔۔۔۔ اردو تحقیق اپنے پیراڈائم سے جتنا گہرا اطمینان محسوس کرتی ہے، دوسرے علوم کے پیراڈائم سے اُتنی ہی بے نیازی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ تبدیلی و انحراف کی خواہش کی جگہ اٹوٹ وابستگی اور غیر مشروط مصالحت کی آرزو، اردو تحقیق میں عام ہوئی ہے۔ اگر کہیں تبدیلی و انحراف کا شائبہ محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ اردو تحقیق کی 'نظر' یا پیراڈائم کے اندر ہی پانی کے بلبلے کی طرح نمودار ہوتا اور گم ہو جاتا ہے۔[۳]

تحقیق اپنا اعتبار تبھی قائم کر پاتی ہے جب اس کا ہر عمل اور ہر قدم منظم، واضح، مربوط اور معروضی ہو۔ ادبی تحقیق میں ریاضیاتی معروضیت ممکن نہیں لیکن اس کے طریق کار کی تنظیم اور وضاحت ممکن ہے۔ ضروری ہے کہ محقق کو اپنا طریق معلوم ہو اور اس کا ہر قدم مربوط انداز میں آگے بڑھے۔ الل ٹپ طریقے کو تحقیق نہیں کہا جا سکتا جو محقق کو جہاں پہنچا دے وہ اسی کو منزل کا نام دے۔ ڈاکٹر عطش درانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> تحقیق (Research) صرف سائنٹفک طریقے پر انجام دی جاتی ہے۔۔۔۔ اگر اردو والوں کو اپنی تحقیق کو اس ڈسپلن کی سطح پر منوانا ہے تو پھر اسی ڈسپلن کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور ثابت کرنا ہو گا کہ وہ بھی زبان کے لیے تجربہ گاہ استعمال کرتے ہیں خواہ وہ سماجیانہ (Socio) ہو یا نفسیانہ (Psycho)، عملی / اقدامی ہو یا رجحاناتی بیانیہ (Aptitudes Descriptive)، نیز ان کا تحقیقی ڈیزائن متغیرات (Variables) کا تقابلی مطالعہ کرتا ہے اس لیے وہ کسی بھی سائنسی تحقیق

کے ہم پلہ (At par) ہیں۔ ان کا تحقیقی طریقہ (Research Method) واضح اور ٹھوس ہو گا۔ (۴)

اس طرزِ عمل کو سمجھنے کے لیے تحقیق کاروں کو تحقیق کے طریقے باقاعدہ طور پر پڑھانے چاہئیں اور ان سے مشق کروانی چاہیے تاکہ ان کی تحقیق واقعی تحقیق ثابت ہو، صرف ڈگری حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں۔ اگر تحقیق کا فن اور طریق صحیح طور پر سمجھا نہ گیا تو تحقیق کے نام پر قوم و ملک کی افرادی قوت بھی ضائع ہو گی اور دیگر وسائل بھی۔ اردو کے موجودہ تحقیقی ذخیرے کو دیکھ کر حالات زیادہ حوصلہ افزا معلوم نہیں ہوتے۔ ان حالات پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے ہے:

> میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے بیشتر محققین یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کن اصولوں کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جدید دور کی تحقیق میں اولیت تحقیق کے رہنما اصولوں کو دی جاتی ہے۔ (۵)

یہ ایک لابُدی حقیقت ہے کہ دورانِ تحقیق جن اصولوں کی پیروی کی گئی ہو وہ معلوم و واضح ہوں۔ یعنی محقق کو اپنے تحقیقی ڈیزائن اور طریقِ کار کا علم ہو، اور بہتر یہ ہے کہ وہ اسے اپنی رپورٹ میں کھل کر بیان بھی کر دے۔ اس کے لیے مناسب طریقِ کار یہ ہے کہ مقالے کے شروع کے باب میں "طریقِ تحقیق" کے نام کا جُز شامل کیا جائے تاکہ پڑھنے اور پرکھنے والے کو محقق کے انداز و آلات سے بخوبی واقفیت حاصل ہو جائے اور اسی کی بنیاد پر تحقیق کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ (۶)

موضوع و مسئلے کا تعارف، مقاصدِ تحقیق، سابقہ تحقیقات کا جائزہ، طریق و آلاتِ تحقیق کا تعین، مواد کی جمع آوری، مواد کا تجزیہ اور حاصلات و نتائج کی پیشکش جدید منظم تحقیق کے ضروری عناصر ہیں۔ اس لیے تحقیقی رپورٹ (مقالے) میں بھی یہ تمام عناصر اسی ترتیب کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ یوں ایک منظم، باضابطہ اور ثمر آور تحقیق سامنے آتی ہے۔ مواد کی جمع آوری تحقیقی ڈیزائن کا ایک اہم عنصر ہے۔ سماجی علوم کی تحقیقات میں اکثر تحقیقی کائنات (Universe) وسیع ہوتی ہے اس لیے تمام آبادی (Population) سے مواد جمع کرنے کی بجائے 'نمونہ بندی' (Sampling) کا طریقِ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ نمونہ بندی میں وسیع آبادی کی نمائندگی کے لیے ایک خاص تعداد کا نمونہ منتخب کیا جاتا ہے اور اس نمونے کی بنیاد پر نتائج حاصل کر کے اس کا اطلاق پوری آبادی پر کر لیا جاتا ہے۔ نمونہ بندی کا بنیادی نکتہ 'صحیح نمائندگی' ہے لیکن اس کا انحصار موضوع پر ہوتا ہے کہ اس کے لیے امکانی نمونہ بندی کی جائے یا نیم امکانی۔ جدید تحقیق میں دونوں قسم کی نمونہ بندی سے کام لیا جا رہا ہے اور دونوں سے قابلِ اعتماد نتائج حاصل کیے جا رہے ہیں۔

امکانی نمونہ بندی(Probability Sampling)وہ نمونہ بندی ہوتی ہے جس میں آبادی کے ہر جُز کے انتخاب کا امکان برابر ہو۔اس کے ذیل میں سادہ اتفاقی نمونہ بندی(Simple Random Sampling)، منظم اتفاقی نمونہ بندی(Systematic Random Sampling)، طبقاتی نمونہ بندی(Stratified Sampling)، گروہی نمونہ بندی(Cluster Sampling) شامل ہیں۔ دوسرا زُمرہ نیم امکانی نمونہ بندی(Non-Probability Sampling)کا ہے جس میں آبادی کے ہر جُز کے انتخاب کا امکان برابر نہیں ہوتا۔ سہولتی نمونہ بندی(Convenience Sampling) ، مقصدی نمونہ بندی(Deliberate/Purposive Sampling) ، پارکھی نمونہ بندی(Judgement Sampling) ، کوٹہ نمونہ بندی(Quota Sampling)، وغیرہ اس زُمرے میں آتے ہیں۔(۷)

نمونہ بندی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے بڑی اور وسیع کائنات / آبادی پر محیط تحقیق کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچادیا جاتا ہے۔اس میں یہ پابندی کی جاتی ہے کہ کسی اصول کی پیروی کی جائے اور اس کو کائنات کا زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ عطش درانی کے الفاظ میں "ہمارا مفروضہ یہ ہوتا ہے کہ نمونہ بندی اس طرح سے کرلی گئی ہے کہ یہ پوری آبادی کی نمائندہ ہے اور ہمارے نتائج کم و بیش پوری آبادی پر لاگو ہوں گے۔(۸)

نمونہ بندی کی تکنیک کا استعمال سماجی علوم میں کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بیانیہ تحقیق زیادہ کی جاتی ہے۔ بیانیہ تحقیق کا تعلق حالیہ مسائل اور موضوعات سے ہوتا ہے اس لیے اس کا یونیورس / آبادی عموماً وسیع ہوتی ہے۔وسیع آبادی تک رسائی اور ان سے مطلوبہ مواد کا حصول یا ممکن نہیں ہوتا یا اس کے لیے بہت زیادہ وقت اور وسائل درکار ہوتے ہیں۔اس لیے ایسی تحقیق میں مواد کی جمع آوری کے لیے نمائندہ نمونہ بندی کا سہارا لیا جاتا ہے۔یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادبی تحقیق میں نمونہ بندی کی کتنی ضرورت اور گنجائش ہے۔تو حقیقت یہ ہے کہ ادبی تحقیق میں بھی کچھ موضوعات وسیع ہوتے ہیں اور ان میں نمونہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ان تحقیقات میں محققین نمونہ بندی کرتے بھی رہے ہیں لیکن اس کے لیے نمونہ بندی کا نام استعمال نہیں کیا گیا اور نہ ہی تحقیقی طریقِ کار میں اس کا ذکر یا صراحت کی گئی ہے۔اس حوالے سے ش۔اختر کے الفاظ مسئلے کی وضاحت میں بہت معاون ہیں:

> ادبیات میں بھی اس تکنیک سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔وہ شعری ادب ہو یا افسانوی، ہر صنف میں اس تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس تکنیک کی ناواقفیت کی وجہ سے ضروری اطلاعات حاصل نہ کرپائیں۔(۹)

اپنی بات کی وضاحت کے لیے مثال پیش کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

مان لیجیے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کے رویوں سے ہمیں بحث کرنی ہے یا تحقیق کرنی ہے۔ اگر منٹو نے ایک ہزار افسانے لکھے ہیں اور ہر افسانے میں تین نسوانی کردار ہیں تو تین ہزار نسوانی کرداروں کے رویوں کا مطالعہ خاصا دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے ہم نمائندہ افسانوں کی روشنی میں ایسے کرداروں کا انتخاب کریں گے جن کے رویوں کے مطالعے کے بعد ہم سعادت حسن منٹو کے نسوانی کرداروں کے رویوں اور سلوک کے متعلق قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ (۱۰)

محترم ش۔ اختر نے ایک ادیب کے کام پر تحقیق کی مثال دی ہے، اس کے علاوہ کسی دور، علاقے، دبستان، تحریک کے ادبیات یا خصوصیات پر تحقیق کرتے ہوئے بھی نمونہ بندی کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان موضوعات پر متعلقہ مواد کی وسعت اتنی ہوتی ہے کہ سب تک رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی اور نہ ہی سب مواد کا تجزیہ لازمی ہوتا ہے۔ بلکہ محقق جو نمونے اہم سمجھتا ہے انھی کو اپنی تحقیق میں شامل کر لیتا ہے اور درست نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں ایک نکتہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کی تحقیقات میں نمونہ بندی کے لیے جو تکنیک اختیار کی جاتی ہے وہ نیم امکانی نمونہ بندی ہے۔ اکثر مثالوں میں مقصدی نمونہ بندی (Deliberate/Purposive Sampling) یا پارکھی نمونہ بندی (Judgement Sampling) کا استعمال کیا گیا ہے۔ مقصدی نمونہ بندی وہ ہے جس میں محقق وہ مواد اٹھاتا ہے جو اس کے مقصد (موضوعِ تحقیق) سے متعلق ہو۔ جس مواد کا اس کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں بنتا وہ اس مواد کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح پارکھی نمونہ بندی میں محقق وہ مواد زیرِ استعمال لاتا ہے جو اس کی سمجھ و پرکھ کے مطابق اس کے مسئلے / موضوع کے حل میں مددگار ثابت ہوتا ہو۔ آبادی کے وہ اجزا بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو موضوع کے حوالے سے مہارت رکھتے ہوں۔ اس قسم کی نمونہ بندی کے لیے Anol Bhattacherjee نے مہارتی نمونہ بندی (Expert Sampling) کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اس تکنیک کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> Expert Sampling: Respondents are chosen in a non-random manner based on their expertise on the phenomenon being studied. (11)

علاوہ ازیں اردو تحقیق میں کوٹہ نمونہ بندی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ جن موضوعات میں کوئی مقدار مقرر کی جاتی ہے وہ کوٹہ نمونہ بندی ہی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی محقق نے "اردو سوانح عمریوں میں خارقِ عادت واقعات: منتخب پچاس سوانح

عمریوں کے تناظر میں" کے موضوع پر تحقیق کی ہے تو واضح طور پر اس نے مقصدی نمونہ بندی کی ہے لیکن ساتھ میں اس نے کوٹہ نمونہ بندی بھی کی ہے۔ مقصدی نمونہ بندی اس طرح کہ اس نے ان سوانح عمریوں کو اٹھایا ہے جن میں خارقِ عادت واقعات موجود ہوں۔ اور کوٹہ نمونہ بندی تو تعداد کی پابندی سے ظاہر ہو رہی ہے کہ اس نے خارقِ عادت واقعات والی ساری سوانح عمریاں نہیں اٹھائیں بلکہ ان سے نمونے کے طور پر صرف پچاس سوانح عمریاں ہی منتخب کی ہیں۔

اس مقالے کی تیاری کے لیے ہم نے ایم فل و پی ایچ ڈی اردو کے لیے لکھے جانے والے پچاس مقالات کا مطالعہ کیا۔ یہ مقالات ہائر ایجوکیشن کمیشن کی ویب سائٹ پاکستان ریسرچ ریپوزٹری سے وقتاً فوقتاً حاصل کیے گئے۔ حاصل کردہ مقالات کی کل تعداد ۱۵۰ ہے جن میں سے منظم اتفاقی نمونہ بندی کے ذریعے پچاس مقالات چنے گئے۔ طریق یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے تین پرچیاں بنائی گئیں جن پر ایک، دو، تین کے اعداد لکھے ہوئے تھے۔ قرعہ کے ذریعے ان میں سے ایک پرچی نکالی گئی۔ اس پر دو کا عدد لکھا ہوا تھا۔ اس طرح فہرست میں دوسرے نمبر پر موجود مقالہ پہلا مقالہ منتخب ہوا، اس کے بعد ہر تیسرا مقالہ (۲، ۵، ۸، ۱۱۔۔۔) نمونے کے لیے منتخب ہوا۔ ان مقالات کے طریقِ تحقیق کا جائزہ لیا گیا اور ان میں نمونہ بندی کرنے والے مقالات کا تناسب دیکھا گیا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ محقق نے نمونہ بندی کے طریقِ کار کا جواز اور وضاحت دی ہے یا نہیں۔ اس مطالعے کے نتائج ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

جدول نمبر ۱: نمونہ بندی و غیر نمونہ بندی والے مقالات کی تعداد

نمبر شمار	نمونے کے لیے حاصل کردہ مقالات کی کل تعداد	نمونہ بندی کا استعمال کرنے والے مقالات کی تعداد	نمونہ بندی کی وضاحت اور جواز پیش کرنے والے مقالات کی تعداد	نمونہ بندی کا استعمال نہ کرنے والے مقالات کی تعداد
۱	۵۰	۲۱	کوئی نہیں	۲۹
		۴۲ فی صد		۵۸ فی صد

جدول نمبر ۲: نمونہ بندی کی استعمال شدہ اقسام

نمبر شمار	نمونے کے لیے حاصل کردہ مقالات کی کل تعداد	نمونہ بندی کا استعمال کرنے والے مقالات کی تعداد	پارکھی / مہارتی نمونہ بندی والے مقالات کی تعداد	مقصدی نمونہ بندی والے مقالات کی تعداد	سہولتی نمونہ بندی والے مقالات کی تعداد
۱	۵۰	۲۱	۰۸	۱۱	۰۲
			۳۸فی صد	۵۲فی صد	۱۰فی صد

منتخب نمونے کے تجزیے سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ نصف سے زیادہ مقالات (۲۹) میں نمونہ بندی نہیں کی گئی۔ ان میں سے ۲۵ مقالات میں نمونہ بندی کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ موضوعِ تحقیق کی کائنات / آبادی وسیع نہیں تھی اور محقق نے تمام آبادی سے اپنا تحقیقی مواد اکٹھا کیا تھا۔ لیکن ان مقالات میں سے چار ایسے بھی ہیں جن میں نمونہ بندی کی ضرورت تھی، لیکن نمونہ بندی نہیں کی گئی۔

۲۔ یہ مقالات ۱۹۵۵ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یعنی ان میں خاصے پرانے مقالے بھی زیرِ مطالعہ آ گئے ہیں اور نئے مقالے بھی (۲۰۰۰ء سے پہلے کے ۱۱ مقالات اور ۲۰۰۰ء کے بعد کے ۳۶ مقالات نمونے میں شامل ہیں۔ تین مقالات کے دستیاب نسخوں پر تاریخ درج نہیں)۔ ۱۹۵۵ء کا مقالہ (اردو ادب میں طنز و مزاح) منتخب نمونے میں قدیم ترین ہے، اس مقالے میں بھی مقصدی نمونہ بندی سے کام لیا گیا ہے۔

۳۔ اکیس (۲۱) مقالات میں نمونہ بندی کی گئی ہے، لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی بھی مقالہ نگار نے نمونہ بندی کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے اور نہ اپنے طریقِ نمونہ بندی کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ زیرِ مطالعہ نمونے میں ڈاکٹر عطش درانی (۱۹۹۰ء) کا مقالہ بھی آ گیا ہے۔ اس مقالے میں محقق نے تحقیق کے جدید طریقے پوری وضاحت کے ساتھ برتے ہیں، اور مقالے کے متن میں ہی طریقِ تحقیق بیان کیا ہے۔ مقالے کے صفحہ ۸ اور ۹ پر محقق نے بیانِ مسئلہ، مقصدِ تحقیق، اہمیتِ مطالعہ، طریقِ تحقیق، تحدیدِ تحقیق، تحقیق طلب فرضیے وغیرہ عنوانات دے کر اپنا پورا طرزِ عمل بیان کیا ہے۔[۱۲] چونکہ اس مقالے

میں نمونہ بندی کی ضرورت ہی نہیں تھی، اور محقق نے اپنی پوری کائنات کو تحقیق کا موضوع بنایا ہے، اس لیے اس مقالے میں بھی نمونہ بندی کی اصطلاح استعمال نہیں کی جا سکی۔

۵۔ ان مقالات میں نمونہ بندی کی تین تکنیکیں؛ سہولتی، مقصدی، پار کھی استعمال کی گئی ہیں۔ یہ تینوں تکنیکیں نیم امکانی نمونہ بندی کے ذیل میں آتی ہیں لیکن ان تکنیکوں کا جن موضوعات میں استعمال کیا گیا ہے، وہاں یہ درست اور مناسب ہیں اور تحقیقی طریقِ کار کے مطابق ہیں۔

۶۔ چھے مقالات میں طریق و مقاصدِ تحقیق وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جن میں سے دو میں نمونہ بندی بھی کی گئی ہے۔ لیکن ان میں بھی نمونہ بندی کی اصطلاح اور مستعمل تکنیک کے بارے میں کوئی لفظ نہیں لکھا گیا۔

۷۔ ۱۹۵۵ء میں کی جانے والی تحقیق میں نمونہ بندی جس طرح سے برتی گئی ہے، ۲۰۱۳ء والے مقالات میں بھی اسی طرز کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اردو تحقیق ایک قدم بھی آگے بڑھتی نظر نہیں آئی۔

۸۔ تحقیق کا ہر قدم واضح، مربوط اور بیان شدہ ہو تو وہ تحقیق قابلِ اعتماد، معتبر اور قابلِ اعادہ ہوتی ہے۔ سی۔ آر۔ کوٹھاری کے الفاظ میں:

> Its methodology is made known to all concerned for critical scrutiny and for use in testing the conclusions through replications. (13)

اسی بابت ڈاکٹر شفیق انجم کی رائے بھی یہی ہے کہ "سکالر کو واضح طور پر بتا دینا چاہیے کہ کیا بات اس کے دائرۂ تحقیق میں ہو گی اور کیا نہیں اور اس کی وجہ کیا ہے۔ عام طور پر بغیر کوئی وجہ بتائے مواد منتخب کر لیا جاتا ہے، یا کچھ مواد چھوڑ دیا جاتا ہے، ادوار کی تقسیم کر لی جاتی ہے، یا اہم اور غیر اہم کی بابت فیصلہ سنا دیا جاتا ہے؛ یہ علمی اپروچ نہیں"۔ (۱۴) منتخب نمونے کے مقالات ان معیارات پر پورا نہیں اترتے۔

۹۔ محققین کا نمونہ بندی کر کے بھی اس کا ذکر نہ کرنا ایک نکتہ سامنے لاتا ہے کہ انھیں طریقِ تحقیق پڑھاتے ہوئے یہ تکنیک پڑھائی ہی نہیں گئی یا اس پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی، بصورتِ دیگر وہ اپنے طرزِ انتخاب کی ضرور وضاحت کرتے۔

۱۰۔ موجودہ دور میں جس علمی شعبے (ڈسپلن) کا عملی زندگی سے رابطہ ٹوٹ جائے، وہ اپنی اہمیت اور قدر برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر لسانی و ادبی تحقیق نے اپنی اہمیت برقرار رکھنی ہے تو اسے اپنا دامن پھیلانا ہو گا۔ اردو تحقیق میں ابھی تک

تاریخی اور دستاویزی تحقیق کا چلن جاری ہے، اور بیانیہ تحقیق(Descriptive Research) مکمل نظر انداز کی جارہی ہے۔ بیانیہ تحقیق 'کیا تھا' کی بجائے 'کیا ہے' اور 'کیا ہونا چاہیے' سے سروکار رکھتی ہے، اردو تحقیق اس سے مزید صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ اور جب تحقیق بیانیہ ہو تو لامحالہ نمونہ بندی کی ضرورت اور زیادہ بڑھے گی۔ اس لیے جامعات کو نمونہ بندی کے طریقوں اور طریقِ استعمال کی تدریس پر توجہ دینی چاہیے۔

مندرجہ بالا نکات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تکنیک ہائے نمونہ بندی کی تدریس کو طریقِ تحقیق (Research Methodology) کے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ جدید دور میں تحقیق کار کو تحقیق کے ضروری اور نمایاں مروّج طریقے پڑھانا بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تحقیق کا ہر موضوع اور ہر مسئلہ الگ طریقِ کار کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر محقق کو تحقیق کے طریقوں اور تکنیکوں پر عبور حاصل ہو گا تو وہ پیش آمدہ مسائل سے بہتر طور پر نمٹ سکے گا۔ تحقیق کے دوران کسی بھی مرحلے پر یہ محسوس نہیں ہو گا کہ محقق نے جان چھڑائی ہے اور بھرتی کے نتائج پیش کیے ہیں۔ اس سے تحقیق اپنا اعتبار اور اعتماد بھی بخوبی قائم کر پائے گی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو میں تحقیقی ڈیزائن کا جائزہ، مشمولہ 'اردو تحقیق (منتخب مقالات)' مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۰

۲۔ عامر سہیل، ادبی تحقیق: مسائل اور رفتار، مشمولہ 'اردو تحقیق (منتخب مقالات)'، ص ۹۴

۳۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، اردو تحقیق کے پیراڈائم پر ایک نظر: سماجی سائنسوں کے پیراڈائم کی روشنی میں، مشمولہ 'مقالاتِ عالمی اردو کانفرنس (اعلیٰ تعلیم: تحقیقی و تدریسی مسائل اور ان کا حل)' مرتبہ بادشاہ منیر بخاری، شعبۂ اردو، جامعہ پشاور، پشاور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۴۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو زبان کی تحقیقی اور ترقیاتی وسعتیں، مشمولہ 'اردو تحقیق (منتخب مقالات)'، ص ۳۵

۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، صریر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۱

۶۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اعلیٰ تعلیم: تدریسی اور تحقیقی مسائل۔کچھ معروضات، مشمولہ 'مقالاتِ عالمی اردو کانفرنس (اعلیٰ تعلیم: تحقیقی و تدریسی مسائل اور ان کا حل)' مرتبہ بادشاہ منیر بخاری، ص ص ۳۳۴-۳۳۵

7. Kothari, C.R., *Research Methodology- Methods and Techniques*, 2nd Edition, New Age International Publishers, New Delhi, 2004, p. 15

۸۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اصولِ ادبی تحقیق (تکنیکی امور)، نذیر سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۰

۹۔ ش۔ اختر، تحقیق کے طریقہ کار، مشمولہ 'اردو میں اصولِ تحقیق (حصہ اول)' مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اردو اکیڈمی، لاہور، بار دوم ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵

11. Bhattacherjee, *Anol, Social Science Research-Principles, Methods and Practices*, Textbooks Collection, Book 3. 2012, p. 69

۱۲۔عطاء اللہ خان عطش درانی، اردو میں اصطلاحات سازی کی کوششوں کا جائزہ(مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی)، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ص ۸۔۹

13. Kothari, C.R., *Research Methodology– Methods and Techniques*, P. 09

۱۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، قواعدِ تحقیق و تدوین، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۵۰

References in Roman Script:

1. Atsh Durrani, Dr., Urdu mai Tehqeeqi Design ka Jayeza, mashmoola '*Urdu Tehqeeq (Muntakhab Maqalat)*' murattaba Dr. Atsh Durrani, Muqtadira Qaumi Zuban, Islamabad, 2003, p. 120
2. Aamir Sohail, Adabi Tehqeeq: Masayil aur Raftar, mashmoola '*Urdu Tehqeeq (Muntakhab Maqalat)*', p. 94
3. Nasir Abbas Nayyar, Dr., Urdu Tehqeeq ke Paradigm par Aik Nazar: Samaji Scienso ke Pardigm ki Roshni mai, mashmoola '*Maqalat e Aalami Urdu Conference (Aala Taaleem: Tehqeeqi w Tadreesi Masayil aur Un ka Hal*), murattaba Badshah Munir Bukhari, Shoba e Urdu, University of Peshawar, Peshawar, 2009, pp. 110-111
4. Atsh Durrani, Dr., Urdu Zuban ki Tehqeeqi aur Taraqqiyati Wusaten, mashmoola '*Urdu Tehqeeq (Muntakhab Maqalat*), p. 35
5. Tabassum Kashmiri, Dr., *Adabi Tehqeeq ke Usool*, Sareer Publications, Lahore, 2020, p. 11
6. Javed Iqbal, Dr., Aala Taaleem: Tadreesi aur Tehqeeqi Masayil-Kuch Maaroozat, mashmoola '*Maqalat e Aalami Urdu Conference (Aala Taaleem: Tehqeeqi w Tadreesi Masayil aur Un ka Hal*), murattaba Badshah Munir Bukhari, pp. 334-335
7. Kothari, C.R., *Research Methodology- Methods and Techniques*, 2nd Edition, New Age International Publishers, New Delhi, 2004, p. 15
8. Atsh Durrani, Dr., *Usool e Adabi Tehqeeq (Tekniki Umoor)*, Nazeer Sons Educational Publishers, Lahore, 2011, p. 210
9. Sheen Akhtar, Tehqeeq ke Tariqa e Kar, mashmoola '*Urdu mai Usool e Tehqeeq (Hissa Awwal)*' murattaba Dr. M. Sultana Bakhsh, Urdu Academy, Lahore, 2nd Edition, 2012, p. 107
10. Ibid, p. 105
11. Bhattacherjee, Anol, *Social Science Research-Principles, Methods and Practices*, Textbooks Collection, Book 3., 2012, p. 69
12. Attaullah Khan Atsh Durrani, *Urdu mai Istelahat Sazi ki Koshisho ka Jayeza* (Ph. D Dissertation), Punjab University Oriental College, Lahore, 1990, pp. 8-9
13. Kothari, C.R., *Research Methodology- Methods and Techniques*, p. 09
14. Shafiq Anjum, Dr., *Qawaid e Tehqeeq w Tadween*, Poorab Academy, Islamabad, 2015, p. 50.

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.335

وسیم عباس
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

"جانگلوس" میں تانیثیت کے مقامی پہلو: تجزیاتی مطالعہ

Waseem Abbas
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Islamic Internation University Islamabad
Dr. Aziz Ibn ul Hassan
Associate professor, Department of Urdu, Islamic International University Islamabad

Local Aspects of Feminism in "Jangloos": An Analytical Study

ABSTRACT

Shaukat Siddiqui is well known progressive short story writer and novelist in Urdu Literature. His novel *"Jangloos"* completely portrays the Pakistani society. The following research is an attempt to analyze novel "*Jangloos*" through a feminist lens, but this critical approach has been localized at length. Therefore, the analysis of *"Jangloos"* will be carried out by using local feminist approaches. The research will be focusing on the issues like exploitation, marginalization, and oppression that women face in *"Jangloos"*. The research therefore is not only a textual analysis of but also a contextual and cultural study of the novel. In the context of this novel, an attempt has been made to explore the role of women in agricultural production and the venerability of women according to rural customs.

Keywords: *Shaukat Siddiqui, Jangloos,Novel, Local Feminism, Pakistani culture*

شوکت صدیقی اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل ادیب ہیں۔ شوکت صدیقی کی وجہ شہرت ان کا شاہکار ناول خدا کی بستی ہے۔ ان کی تحریروں میں خارجی ماحول کی عکاسی اور عہدِ حاضر کے معاشی و معاشرتی اور طبقاتی استحصال کی منظر کشی نظر آتی ہے۔ ادیب اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنا تخلیقی سفر طے کرتا ہے ۔ تانیثیت کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ عورت کیا ہے؟ عورت بطور "انسان" یا بطور "شے"؟ تاریخ انسانی میں عورت کے بارے میں مختلف تصورات و نظریات پیش کیے گئے ہیں اور عورت کو تصوراتی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اور کامل عورت کو "سیمون دی بوا" نے

Received: 11thFeb, 2023 | Accepted: 5th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

نہایت مختصر انداز میں پیش کیا ہے جس کو رد کرنا قدرے مشکل ہے کہ "عورت پیدا نہیں ہوتی بنا دی جاتی ہے۔"(۱)
شوکت صدیقی کا ناول جانگلوس اردو کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے. مذکورہ ناول تین جلدوں اور دو ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے جانگلوس کو پاکستان کی ابتدائی دو دہائیوں کا معاشرتی، سیاسی و سماجی اور معاشی منظر نامہ کہا جا سکتا ہے۔ جانگلوس کا کینوس خاصا وسیع ہے اس میں قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کے کردار ایک جرائم سے بھرپور معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں یہ کردار جیل میں کسی فرد کے مجرم ہوتے ہیں۔ لیکن جیل سے فرار ہونے کے بعد یہ اجتماعی معاشرے کے اور اپنے ضمیر کے قیدی بنتے ہیں۔ ناول "جانگلوس" عصری تاریخ اور سیاسی و سماجی حالات واقعات کا مجموعہ ہے۔ ناول کے موضوعات میں قیامِ پاکستان کے بعد کا معاشرتی منظر نامہ ہے تقسیمِ ہند، فسادات، مہاجرین کا نئے خطے میں جدید مسائل سے سامنا، جھوٹے کلیم، قیام پاکستان کے بعد جاگیر دارانہ نظام، عوام کا استحصال، حکومتی امور کو چلانے کے اصول، چھوٹے اور بڑے چوروں کی نفسیات الغرض معاشرتی ناہمواریوں کے اظہار کا نام جانگلوس ہے۔ تانیثیت کے مقامی پہلوؤں میں انسانی بنیادی حقوق کا مطالبہ شامل ہے جیسے کہ تعلیم کا حق، ووٹ کا حق، آنے جانے کی آزادی، اپنی مرضی کا پیشہ، پسند کی شادی، صحت، ملازمت اور سماجی حقوق میں مرد سے نہ زیادہ نہ ہی کم حقوق کا حصول۔ اس کے علاوہ غیرت کے نام پر قتل، عورت کی خرید و فروخت، وٹہ سٹہ، کم عمری کی شادی اور بدلِ صلح جیسی فرسودہ روایات پر آواز اٹھانا تانیثیت کے مقامی پہلوؤں میں شامل ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اکیسویں صدی میں متنازع صورت اختیار کر رہی ہے۔ عورت روایات اور ذہنی و جسمانی تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ مسائل کی نوعیت میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسائل کے ختم ہونے یا کم ہونے کے امکانات ناپید ہیں۔ ورکنگ ویمن، شہری عورت کو گھر بار کے ساتھ دفتر اور دیگر سماجی ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہری عورت بظاہر مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہے لیکن عورت کے ساتھ سماجی رویہ ایک طرح کی خدا ترسی اور رحم سے پیش آنے والا ہوتا ہے۔ عورت کسی شعبے کی سربراہی کے لیے قابل قبول نہیں، گھر سے باہر اپنی کارکردگی کے ساتھ آزاد عورت کے تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ گھر میں آکر گھریلو ذمہ داریاں بچوں کی تربیت کو بہتر کرنا، یہ وہ مسائل ہیں جو کہ تانیثیت کے مقامی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ شوکت صدیقی کے ناول جانگلوس میں سماجی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ عورت کے مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں۔ عورت ذات ایک نوعیت کی جدوجہد میں مصروفِ عمل دکھائی دیتی ہے۔ آزاد عورت، ایلیٹ کلاس کی عورت کی بظاہر نظر آنے والی آزادی کو بھی جانگلوس میں قاری پر عیاں کیا گیا ہے، ناول میں اس کا بہترین اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ عورت سماجی تاریخ سے غائب نظر آتی ہے۔ عورت کا ذکر شعر و ادب اور سماج میں اکثر اوقات ثانوی حیثیت سے یا بطور شے ہوتا ہے۔ بطور انسان عورت کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔ ان تشنہ پہلوؤں کو تانیثیت زیر بحث لاتی ہے کہ عورت کا ذکر زیادہ تر اس کی خوبصورتی، شادی بیاہ یا سماجی واقعے کے

حوالے سے ہوتا ہے۔ اہم سماجی تحریکوں کے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ عورت بطور موضوع کم ہی زیر بحث آتی ہے۔ ہمارے ہاں اردو ادب میں تقسیمِ ہند کے موقع پر ہجرت اور فسادات میں بے شمار عورتوں کو سماجی ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حوالے سے عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کو چند تخلیق کاروں نے موضوع بنایا۔ شوکت صدیقی نے تقسیم کے بعد پاکستانی عورت کو درپیش مسائل کی صورتحال بیان کی۔ یوں تو خدا کی بستی میں ایک عورت کے ساتھ ہونے والے مسلسل غیر انسانی رویوں کو سامنے لایا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ جانگلوس میں بھی مجرم کرداروں کی کہانی کے ساتھ ساتھ نسائی کرداروں کا المیہ سامنے لایا گیا ہے۔ نوراں، شاداں، جمیلہ، طاہرہ اسی طرح مزارعوں کی عورتوں پر ظلم و ستم کو جانگلوس میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ جانگلوس میں ایلیٹ کلاس کی خواتین کو دکھایا جاتا ہے کہ ایک کلب میں مذکورہ کلاس کی عورت کس طرح بطور "شے" "partner swapping" کے گھناؤنے فعل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پدر سری نظامِ حیات نے مرد اساس سماج کی بنیاد رکھی اور عورت کو ذاتی ملکیت قرار دیتے ہوئے عورت کو بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا۔ تب سے آج تک عورت اپنے وجود ذات کے اثبات اور اصلیت کے حصول کے لیے سرگرداں ہے۔ یہ جدوجہد ایک ارتقائی و فکری سفر صدیوں پر محیط ہے۔ اس سماجی تحریک میں صرف عورت کے بنیادی حقوق نہیں بلکہ عورت کے ثقافتی وجود اور شناخت کی تلاش کا کام بھی کیا جو کہ مرد اساس سماج میں گم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے:

> "بین الاقوامی سطح پر تحریک حقوقِ نسواں ایک معاشرتی نظریہ ہی نہیں سیاسی تحریک بھی ہے جو عورت کے سماجی رتبے اور کردار کے تعین اور معاشرے میں اس کے تشخص کے اظہار کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیتی ہے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ صنف کی بنیاد پر عدم مساوات کے مظاہر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے جو کم و بیش تمام معاشروں میں کہیں تہذیب و تمدن کے نام پر تو کہیں مذہب کی آڑ میں مستقل جاری و ساری ہے۔"(۲)

تانیثیت کا مقامی پہلو انسانی معاشرے میں سماجی ناہمواریوں سے عورت ذات کو درپیش ممکنہ مسائل اور ان مسائل کے پس پردہ محرکات کا احاطہ کرتی ہے۔ آئے روز عورت کو سماجی ناہمواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کو کبھی غیرت کے نام پر قتل کیا جاتا ہے یا اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا جاتا ہے۔ دفتروں میں ملازمت کرنے والی خواتین کے دہرے مسائل کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ شہری اور دیہی عورت کے مسائل کی بدلتی ہوئی صورت حال کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تانیثیت کا مقامی پہلو ہماری مقامی عورت کے سماجی اور غیر انسانی رویوں کا تقاضا کرتا ہے کہ اکیسویں صدی میں آزاد، روشن خیال اور پڑھی لکھی اور باشعور عورت کے مسائل میں کمی کے بجائے مسائل کی نوعیت میں فرق

آیا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اور رتبے کا تقاضا تانیثیت کے مقامی پہلو کا بنیادی موضوع ہے۔ ڈاکٹر فہمیدہ ریاض لکھتی ہے:

"فیمنزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب لوگ اپنی اپنی طرح سمجھتے ہیں۔ مگر میں نے جب بھی اسے استعمال کیا کہ میں "فیمنسٹ" ہوں تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے او راس کے کسی بھی پہلو کو کچل کرنا بود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔"(۳)

ایک عام قاری ناول یا افسانے کو وقت گزاری کے لئے اور ذہنی تفریح کے لئے پڑھتا ہے لیکن ادب کا سنجیدہ طالب علم پڑھتے ہوئے گزرے ہوئے عہد اور معاشرتی مسائل کا تجزیہ کرتا ہے۔ جانگلوس میں کسی طبقے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ نشانِ عبرت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ نشانِ عبرت بننے والے کون ہیں؟ یہ سوال ہر سنجیدہ پڑھنے والا اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھ کر بخوبی کر سکتا ہے۔ ناول نگار نے کرداروں کے ذریعے بھیانک تاریخی واقعات اور شخصیات کی طرف مبہم صورت میں قاری کی توجہ کو متوجہ کیا ہے۔ لالی کا کردار بیوروکریسی اور اس کے تضادات کو قاری پر عیاں کرتا ہے کہ یہ غریب عوام کے لئے کس طرح سوچتے ہیں ان کی پہلی ترجیح میں ذاتی خواہشات اور ذاتی زندگی کے علاوہ عوام کا کس قدر درد چھپا ہوا ہے؟ یہ تمام تر صورتحال ناول میں ایک قدرتی حادثہ پیش آنے سے قاری پر عیاں ہوتی ہے ناول میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"سر! کوئی دو گھنٹے پہلے گمبر سٹیشن کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے زخمی تو بہت سے ہیں ہر طرف چیخ و پکار مچی ہے۔۔۔۔۔ سلیمان نے بے رخی سے کہا، تو میں کیا کروں؟ سکھر! ایسا کرو لاہور یا کراچی سے کوئی اہم کال آئے تو صاف انکار کر دینا کہ ہم چاروں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا۔ اس کے بعد فون ڈیڈ کر دو اور اطمینان سے سو جاؤ آئندہ سے تمہارے لئے یہ قطعی ممنوعہ علاقہ ہو گا"(۴)

دردِ دل کے واسطے انسان کو بیوروکریسی میں لگایا جاتا ہے لیکن ایک قدرتی حادثے پر ان کی بے بسی اور بے حسی کو پڑھ کر قاری کو غیر انسانی رویوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ بیوروکریسی میں شامل افسرانِ بالا جب حادثے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کی سوچ پر افسوس کرنا بھی وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ ناول میں اس واقعے کے بعد اس طرح تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے:

"ماہ رخ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی اور مسعود کو مخاطب کیا۔ مسعود! آپ تو ایسے بے نیاز لگ رہے ہیں جیسے حادثے کا آپ پر کوئی ری ایکشن نہیں ہوا؟ مسعود نے مارہ رخ کو نظر بھر کر دیکھا اور ایش ٹرے

میں پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا ''میں تو سوچ رہا تھا کون سی ایسی قیامت آ گئی گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں کچھ ہسپتال جاتے جاتے یا ہسپتال پہنچ کر مر جائیں گے ''(۵)

ناول نگار اعلیٰ کلاس میں کالی بھیڑوں اور مفاد پرستوں کی ظاہری حب الوطنی اور خدا ترسی کو قاری پر عیاں کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس بے حسی کو قومی چوری اور قومی زوال کا حوالہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح قاری کو کردار لالی سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو کسی فرد یا خاندان کا مجرم ہے جبکہ یہ بے حس طبقہ تو قومی مجرم بننے کے باوجود قومی وقار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

کردار لالی کے مجرم ہونے کے باوجود قاری کا لالی کے ساتھ ہمدردانہ جذبہ قائم رہتا ہے۔ یہ معاشرتی ناہمواریوں کے سبب حالات کا شکار ہے یہ غلط کو غلط کہتا ہے لیکن حالاتِ حاضرہ کے سامنے بے بس ہے یہ مجبوریوں اور سختیوں کی وجہ سے دربدر ہوتا جاتا ہے۔ ناول جانگلوس میں پاکستان بھر کے جاگیر دارانہ سماج کو زیرِ بحث لایا گیا ہے پنجاب کے دیہی علاقوں کی تاریخ اور معاشرتی تصادم یہاں تک کہ شمالی علاقہ جات دیر کے نواب اور اس کی وجہ سے اجتماعی مسائل کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی غریب لاچار عوام کا استحصال کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے اب حاکم کوئی انگریز نہیں بلکہ اپنے ہی خود ساختہ حکمران۔ قیامِ پاکستان کے بعد عوام اور مہاجرینِ فسادات سے متاثر ہو کر ایک امید لے کر پاکستان آتے ہیں۔

لیکن یہاں آ کر اپنے حقوق کی بجائے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتے ہیں ناول میں چوہدری نور الٰہی کا خاندان، اس کی واضح مثال ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں کے جاگیر دار، سرمایہ دار اپنے ماتحتوں کو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہیں۔ ناول میں ایسے متاثرہ کردار بچوں، بوڑھوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

ناول جانگلوس کا دوسرا کردار رحیم داد! زمینداروں، جاگیرداروں اور مزارعوں کے رہن سہن کو قاری پر عیاں کرتا ہے کہ یہ کردار جرم پہ جرم اور جھوٹ پر جھوٹ بولتا ہوا معاشرتی ناانصافی کی وجہ سے کس طرح لوگوں کا استحصال کرتا ہے؟ اپنی پہچان اور شناخت کو لے کر یہ قتل پہ قتل کرتا جاتا ہے لیکن یہ چھوٹا چور بڑے چوروں سے مل کر طاقت پکڑتا ہے۔ یہ کردار رحیم داد! جھوٹے کلیم کا مقدمہ کر کے دوسروں کے حقوق پہ ڈاکا ڈالتا ہے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرہ مختلف تضادات کا شکار رہا تو ایسے میں معاشرے کو ترقی کے بجائے زوال کی طرف گامزن کرنے میں کردار احسان شاہ، کمشنر ہمدانی، اور فیض محمد کا ہاتھ شامل رہا ہے۔ رحیم داد کردار کے ذریعے ناول نگار قاری پر عیاں کرتا ہے کہ معاشرہ کس قدر فرسودہ روایات اور اندھی عقیدت کا شکار ہے۔ کس طرح جاگیر دار مزارعوں کی زندگی اور عزت سے کھلواڑ کرتا ہے۔ رحیم داد کا سفر رحیمے سے شروع ہو کر چوہدری نور الٰہی پر جا کر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس تمام تر ارتقائی سفر میں یہ کردار تین قتل کر کے مزارعوں کی بہن، بیٹی کو اپنی حوس کا نشانہ بناتا ہے۔ کردار اللہ وسایا،

حکیم نذر چشتی کو قتل کر کے سکون کی زندگی گزارتا ہے۔ یہاں تک یہ کردار اپنے قریبی دوست لالی کو یاد تک نہیں کرتا جو کہ برے دنوں کا ساتھی رہا ہے۔

یہ کردار ابن الوقت کی صورت اختیار کرتا ہے یہ کردار اپنی بیوی نوراں اور بچوں کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ دولت کے نشے میں انسان اندھا ہو جاتا ہے نوراں اپنے بچوں اور خود کو جلا دیتی ہے لیکن اس کردار کو فرق نہیں پڑتا یہ کردار شاداں سے شادی کرتا ہے یہ شاداں ایک نسائی کردار ہے جو کہ بھرپور مزاحمت کرتا ہے حالات کے سبب رحیم داد سے شادی کر لیتی ہے لیکن جب رحیم داد کی اصلیت جان لیتی ہے تو ایک رات رحیم داد کو ذبح کر دیتی ہے کردار شاداں سوچتی ہے یہ رحیم داد اس شخص کو قتل کرتا ہے جو کہ اس کی اصلیت جان لیتا ہے تو اس طرح اب میرا نمبر ہے۔ اس لئے شاداں اس کو ختم کر دیتی ہے۔

شاداں ایک نسائی کردار ہے جو کہ مرد کی بے وفائی پر سخت غصہ کرتی ہے یہ نمبردار مردوں کی طرف سے ملنے والے معاشرتی مقام سے محروم ہے یہ رحیم داد، بالے سے شادی صرف سماجی حیثیت کے لئے کرتی ہے لیکن جب مردانہ سوچ کے حامل لوگ اس کو صرف جسمانی بھوک کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ سوچتی ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو چھوڑا بالے کے لئے اور اس نے بے وفائی کی اور اب یہ رحیم داد بھی جھوٹا نکلا یہ بھی کسی وقت مجھے ختم کرنے والا ہے تو یہ کردار سوچتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ ناول میں اس کا بیان یوں ہوا ہے۔

> "شاداں نے بستر کی جانب اشارہ کیا "تو دیکھ بھی لے" لالی نے دیکھا بستر کی چادر پر تکیے پر لال لال خون پھیلا تھا۔ رحیم داد بے جان لیٹا تھا اس کا گلا کٹا ہوا تھا گوشت کے لوتھڑوں سے ابھی تک خون رس رس کر ادھر بہہ رہا تھا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ نہایت خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ لالی کے پہنچنے سے پہلے دم توڑ چکا تھا"(۶)

ناول جانگلوس کو محض دو قیدیوں کی کہانی کہہ دینا کافی نہیں ہو گا۔ شوکت صدیقی جانگلوس کے ثانوی کرداروں یعنی کہ نسائی کرداروں کے ذریعے ایک سماجی جبر کو سامنے رکھ کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ثانوی حیثیت کے حامل نسائی کردار ہر ظالم اور ظلم کا شکار ہوتے نظر آتے ہے۔ جیل کی سلاخوں سے بھاگنے والے یہ دو مجرم عورت ذات کو براہِ راست ذہنی و جسمانی تشدد کا سبب بنتے ہیں۔ مذکورہ ناول میں متاثرہ نسائی کرداروں کی ایک طویل فہرست پائی جاتی ہے جو کہ اپنی جگہ مسلسل سماجی جبر اور مردانہ سماج میں تشدد کا نشانہ بنی ہے۔ یہ دونوں قیدی جیل سے فرار ہونے کے بعد نسائی کردار "شاداں" کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اٹھاتے ہیں۔ شاداں بالے نامی مرد کو قتل کرتی ہے۔ ایسے میں یہ دونوں شاداں کو بلیک میل کرتے ہیں کہ ہمارے لئے کپڑے لاؤ تا کہ ہم جیل کی وردی سے چھٹکارا پا سکیں ورنہ ہم نے باہر لوگوں کو بتانا ہے کہ اس عورت نے قتل کیا ہے۔ ایسے میں شاداں ان کے جال میں پھنس جاتی ہے یوں رحیم داد اور

لالی اس کمزوری کو سبب بنا کر مسلسل اس کو بلیک میل کرتے ہیں۔ شاداں اسی سبب ان کے ساتھ پابند ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ رحیم داد کی بیگم کی زندگی بسر کرنا شروع کرتی ہیں۔ شاداں ایک زبردست نسائی کردار ہے یہ اپنے سے بڑے عمر کے شخص سے شادی پر مجبور کی جاتی ہے تو شادی کے بعد شوہر اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایسے میں شاداں بالے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

یہ روایتی عورت ہے اس کا تصورِ حیات وہی روایتی ہے کہ ایک شوہر ہو گا بال بچے ہوں گے اور زندگی روزمرہ کی طرح بسر ہو گی۔ لیکن بالے کی طرف سے بے وفائی پر شدید غصے کا اظہار کرتی نظر آتی ہے کہ آپ کے لیے میں نے اپنے "کھسم" کو چھوڑا بدلے میں تم بھی وہی روایتی مرد نکلے! ایک عورت کے بعد دوسرے کے شکار میں! اس پر بالے کو چوری سے ذبح کر دیتی ہے۔ اس قتل کو وجہ بنا کر رحیم داد مسلسل اس کو بلیک میل کرتا ہے۔ لیکن شاداں کا مزاحمتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب وہ رحیم داد کی بے وفائی پر لالی کو ذبح کرتی ہے۔

ناول جانگلوس میں نسائی کردار مختلف مقامات پر مختلف نوعیت کے جنسی و معاشی اور معاشرتی استحصال کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہ نسائی متاثرہ کردار جمیلہ، نوراں، شاداں، طاہرہ، جنت بی بی کے ان نسائی کرداروں کا المیہ ہے کہ جاگیر دارانہ سماج میں عورت کو سماجی رتبہ اور مقام نہ ملنے کی وجہ سے عورت مختلف صورتوں میں مردانہ سوچ کی زد میں رہی۔ جاگیر دارانہ سماج میں اپنی بہن بیٹی کا مستقبل زیادہ تر خراب دیکھنے کو ملا ہے۔ شاداں ایک نسائی مزاحمتی کردار ہے جو کہ سماجی رتبہ نہ ملنے پر احتجاج کرتی نظر آتی ہے اپنے سے بڑی عمر کے شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور، مختلف طرح کی مزاحمت کرتی ہوئی رحیم داد تک پہنچتی ہے۔

یہ کردار رحیم داد سے شادی نظریہ ضرورت کے تحت کرتی ہے اس کا بیان ناول میں یوں کرتی ہے۔

"میں نے اس سے صرف اس لئے ویاہ کیا تھا کہ مجھ سے اب دکھ نہیں اٹھائے جاتے تجھے جیل میں دیکھا تھا۔ میرا نہ گھر تھا نہ کوئی ٹکانہ۔۔۔۔۔ ایک بار اپنا گھر اجاڑ کر میں نے سوچا کہ دوبارہ گھر بساؤں گی۔ میرے بال بچے ہوں گے۔ گھر والا ہو گا۔ آرام سے زندگی گزاروں گی۔۔۔۔۔"(۷)

لالی کردار میں دکھی انسانیت کے لئے احساس پایا جاتا ہے یہ لالی شاداں سے سچی محبت کرتا ہے اس کے رومانس میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اب رحیم داد کے قتل کا ذمہ لینے کو تیار ہے لیکن شاداں ٹوٹ چکی ہے ہار چکی ہے۔ لالی کہتا ہے کہ جرم میں اپنے ذمے لیتا ہوں میں تین دفعہ جیل کاٹ چکا ہوں لیکن نہیں شاداں کپڑے تبدیل کرنے کمرے جاتی ہے۔ کافی دیر تک واپس نہیں نکلتی تو لالی دیکھتا ہے کہ ناول میں یوں ذکر ہوا ہے۔

"لالی نے آواز دی کہ شاداں تو اندھیرے میں کیا کر رہی ہے۔ کوئی جواب نہ ملا لالی نے ایک بار پھر پکارا۔ شاداں، لالی مزید نہ ٹھہرا باہر نکلا کمرے میں پہنچا۔

شاداں دم توڑ رہی تھی اس کی گردن میں چاقو پیوست تھا۔ شہ رگ کٹ گئی تھی۔۔۔۔۔ شاداں یہ کیا کیا؟ میں نے سوچا تھا کہ رات کے اندھیرے میں چھپتے چھپتے نکل جائیں گے۔۔۔۔ شاداں ختم ہو گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ لالی اسے سفر آخرت پر جاتے ہوئے دیکھتا ہے"۔ (۸)

دوسرا نسائی کردار جمیلہ "جو کہ اللہ وسایا کی بیگم ہے۔ دونوں ازدواجی زندگی خوشی سے بسر کرتے ہیں۔ جمیلہ پسند کی شادی کر کے اللہ وسایا سے شادی کا فیصلہ کر چکی ہے۔ جمیلہ دیہات میں مزارعے کے بچوں کے لیے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کرتی ہے جو کہ جاگیر دار احسان شاہ کو برا لگتا ہے۔ رحیم داد اللہ وسایا کا مہمان بن کر گھر میں آتا ہے تو جمیلہ کو کسی طرح اپنی طرف کھینچ کر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ احسان شاہ کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو قتل کیا جاتا ہے۔ جمیلہ بے بس، بے سہارا ہوتی ہے ایسے میں جاگیر دارانہ نظام اور مرد معاشرہ عورت کو کمزور دیکھ کر حوصلہ دیتا ہے۔ تو مرد کی وہی روایتی سوچ کہ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے، سماجی حیثیت ادھوری ہے۔ ایسے میں رحیم داد جمیلہ کے سامنے شادی کی آفر کرتا ہے جس کا جمیلہ انکار کرتی ہے۔ رحیم داد زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہاں جمیلہ کو رحیم اور احسان شاہ کی چال سمجھ میں آجاتی ہے کہ دونوں نے مل کر اللہ وسایا کو راستے سے ہٹایا ہے۔ یوں مسلسل مردانہ ذہنی و جسمانی تشدد اور سماجی جبر سے بغاوت کرتی ہوئی اپنے والد کے گھر چلی جاتی ہیں۔

ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

"تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے۔ یہ نیا تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں جنہیں حقوق نسواں، آزادئ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گذشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے۔"(۹)

تیسرا نسائی کردار "نوراں" ہے جو کہ رحیم داد کی بیگم ہے۔ رحیم داد جب جیل میں ہوتا ہے تو یہ جاگیرداروں کی منت سماجت کرتی نظر آتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر جیل سے رہائی دلاؤ۔ جیل میں رحیم داد کے پاس جاتی ہیں روتی ہیں۔ لیکن اس کو وہی ثانوی حیثیت ہی حاصل ہے کہ مرد کے بغیر عورت بُری ہوتی ہے، سماجی حیثیت کم سمجھی جاتی ہے۔ لیکن دوسری جانب وہی مردانہ سوچ کہ دولت ملنے کے بعد اپنی پہچان یہاں تک کہ نام سب کچھ بدل دیتا ہے۔ دولت اور جائیداد کی خاطر اپنے بچوں اور بیگم کو جاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ رحیم داد اب چوہدری نور الٰہی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نوراں رحیم داد کو کہتی نظر آتی ہے کہ ان بچوں کو اور ہم سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں؟ اس کے بعد بچوں سمیت خود کو آگ لگا دیتی ہے۔ یوں ایک ثانوی حیثیت کا حامل کردار بنیادی اکائی کے سامنے اپنی بے بسی کا اعلان کرتا ہے۔ ناول نگار اس کردار کے ذریعے معاشرے میں حاشیے پر رہنے والی مخلوق کا نوحہ پیش کرتے ہیں۔

بیوہ کلثوم بی بی کا سماجی و معاشی استحصال ناول میں دکھایا گیا ہے۔ جس کا شوہر نور الہی اچھی خاصی زمین جائیداد کا مالک ہوتا ہے، رحیم داد چوہدری نور الہی کو قتل کر دیتا ہے جھوٹے فراڈ کیس کے صورت میں تمام تر جائیداد کے کاغذات اپنے نام کر کے عیاشی کرتا ہے۔ یہ متاثرین یتیم ارشاد الہی اور بیوہ کلثوم بی بی جاگیر داروں کے ہاں محنت مزدوری کرتے نظر آتے ہیں۔ بھٹوں پر کام کرتے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام میں یہ کردار سماجی جبر اور معاشی تنگ دستی سے غیر انسانی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لالی کی بھٹی میں مزدوری کرتے ہوئے ان متاثرین سے ملاقات ہوتی ہے تو پتہ چلتا کہ چوہدری نور الہی کے ورثا زندہ ہیں۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری جائیداد پر رحیم داد قابض ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو میں تم لوگوں کو حق دلاتا ہوں۔ اس طرح حق دار کو حق دینے کے لیے لالی ایک سرکل شروع کر دیتا ہے۔ وہاں رحیم داد اداروں میں ابن الوقت کرداروں سے مل کر ان حقیقی ورثا کو خون تھوکنے پر مجبور کرتا ہے۔ نسائی کردار کلثوم کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح اپنے دل کے ٹکڑے یعنی کہ اولاد کے لیے ترستی ہیں۔ لالی کو بددعا دیتی ہیں کہ ہمیں وہی مزدوروں والی زندگی ہی چاہیے یہاں تو ہمیں مزید سزا دی جا رہی ہے اللہ تیرا بیڑا پار کرے ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ یہ ثانوی کردار اولاد کے لیے ترستے ہوئے دکھایا جاتا ہے کہ عورت ذات جو کہ سماجی جبر، گھٹن برداشت کرتی ہے اس کے پیچھے اولاد کی مجبوری ہوتی ہے لیکن یہ جاگیر دارانہ سماج اور سرمایہ دارانہ نظام عورت کو بطور جانور یا شے سمجھ کر مسلسل استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔ ناول نگار نے ان ثانوی کرداروں کے ذریعے معاشرے کی تلخ حقائق سے پردہ ہٹایا ہے۔

لالی ایک انسان دوست کردار ہے خدا ترسی اس کے اندر کسی نہ کسی صورت میں محسوس کی جاسکتی ہے شاداں اور رحیم داد کے مرنے کے بعد وہ جائیداد کے اصلی وارث کو تلاش کرنے لگتا ہے کہ حقدار کو حق دے کر ہی کھیل ختم ہونا چاہیے چوہدری نور الہیٰ جو کہ ایک مہاجر تھا۔ اس کی اولاد سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہے جعلی جھوٹے جاگیر داروں نے اس کی جائیداد پر قبضہ کیا ہے چوہدری نور الہی کا بیٹا ارشاد الہیٰ ایک بھٹے پر مزدوری کرتا ہے جہاں لالی خود بھی کام کرتا تھا ۔ یہ اس کے پاس جاتا ہے کہ تیرا باپ زندہ ہے۔ آپ کی اپنی زمین جائیداد ہے اپنی والدہ کو ساتھ لے کر چلو میں تمہیں حق دلاتا ہوں۔ چوہدری نور الہیٰ کی بیگم سڑکوں پر بھیک مانگتی ہے۔ یہاں پر ناول نگار حق دار کو حق اور ظالم، مظلوم کی مکمل جدوجہد کو سامنے لانا چاہتا ہے اس طرح کا جذبہ ایک اور کردار "پروفیسر سلیم لودھی" بھی ہوتا ہے یہ انگریزی کا پروفیسر ہوتا ہے۔ اس کی ملاقات لالی سے جیل میں ہوئی تھی۔ سلیم لودھی حکومت کے خلاف طالب علموں کو اکساتا ہے تخریب کاری کرتا ہے۔ یہ انگریزی کا پروفیسر انسانی سماج میں سماجی گھٹن اور دشواریوں پر کلاسز میں بچوں سے مکالمہ کیا کرتا تھا حب الوطنی، غداری کیا ہے۔ شہریوں کو اپنے حقوق کا احساس دلانے کے لئے اضافی وقت کلاسز میں لگاتا تھا۔ ناول میں اس کا ذکر یوں ہوتا ہے۔

"ایوب خان اپنے جرنیلوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح ڈاکہ زنی کرتا ہے تو اسے ڈاکا نہیں بلکہ حب الوطنی کہا جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔ مارشل لاء لگا کر طرح طرح کے ضابطوں سے اپنے ہی ملک کے پرامن عوام کو ڈرایا جاتا ہے۔ دھمکایا جائے جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو اسے غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں بلکہ ملک اور قوم کی خدمت ثابت کرنے کے لئے ریڈیو اور اخبارات دن رات پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کیسی کیسی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔۔۔۔۔"۔(۱۰)

ناول جانگلوس میں دو مجرموں کی کہانی یہ صرف دو قیدیوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ کہانی احسان شاہ، کمشنر ہمدانی جیسے ابن الوقت اور بے حس اور دوسری طرف لالی، چوہدری نور الٰہی اور پروفیسر سلیم لودھی پر جا کر ختم ہوتی ہے ۔ناول کا اختتام ایک معاشرتی ناانصافی اور سماجی المیے پر ہوتا ہے۔ کہ حق دار کو حق نہیں ملتا۔ حق کے لئے لڑنے والے کو اذیت ملتی ہے سماج میں شعور و آگہی کو بیدار کرنے والے شخص کو ذہنی و جسمانی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہاں تک کہ دماغی امراض کے ہسپتال تک آدمی پہنچ جاتا ہے۔ حق دار سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں راستوں میں خون تھوکتے ہیں حق دار اور حق دار کا ساتھ دینے والے ناول میں خون تھوکنے کو نصیب سمجھ کر زندگی بسر کرتے ہیں پروفیسر سلیم لودھی، مرحوم چوہدری نور الٰہی کی بیگم کلثوم بی بی لاچار بے بس بیٹے ارشاد الٰہی کی صحت یابی کے لئے دعا مانگتی نظر آتی ہے کلثوم بی بی جائیداد نہیں اپنے دل کے ٹکڑے ارشاد الٰہی کی زندگی کی بھیک مانگتی نظر آتی ہے لالی یہ سب کچھ دیکھتا ہے دوسری طرف ذہنی مریض پروفیسر سلیم لودھی صدا لگاتا ہے، اوئے بھول جا!!!

انسانوں پر مشتمل معاشرے میں غلط اور درست، ظلم اور ناانصافی، حب الوطنی اور غداری میں فرق بتانے والا جیل کی سلاخوں میں بے بس ذہنی مریض کے طور پر موجود ہے۔ کردار کلثوم بی بی کو جب زنانہ پاگل خانے میں پہنچا دیا جاتا ہے تو پاگل خانے کی کوٹھری میں جو ماحول دیکھتی ہے چیخنے لگتی ہے ناول میں اس منظر کو یوں پیش کیا گیا ہے:

"ہائے میں مر گئی یہ تو پاغل خانہ ہے۔ "چپ کرو کنچریو۔ پرے ہٹو۔ میں پاغل شاغل نہیں ہوں" اس نے چیخ چیخ کر لالی کو بھی گالیاں اور کوسنے دیے۔ وئے لالی حرام دے تیرا بیڑا ڈبے۔ ہم جوند سنگھ والا بھلے چنگے تھے۔ خانہ خراب تو پہکا کر ہمیں وہاں سے یہاں پاغل خانے میں ڈلوایا۔ وے تیرا کھ نہ رہے۔ تو مر جائے"۔(۱۱)

کردار لالی جو حق دار کو حق دلانے کی کوشش کر رہا تھا کلثوم بیگم کی چیخ و پکار سن کر بے بسی کا شکار ہے۔ اپنی بے بسی اور مجبوری پر دل ہی دل میں سخت پریشان حال ہے۔ دوسری طرف ارشاد الٰہی فرش پر بے حال پڑا کھانس رہا ہے۔ کھانستے ہوئے خون تھوک رہا ہے شدید بخار میں مبتلا ہے لالی سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا وہ ارشاد الٰہی سے طبعیت دریافت کرتا ہے ناول میں اس کا اظہار یوں ملتا ہے:

"یار کچھ تو بتا، کیسی طبعیت ہے؟ ارشاد الٰہی نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا۔ طبعیت کیسی بھی ہے تجھے اس سے کیا لینا؟ یار تو بھی اپنی ماں کی طرح مجھ سے ناراض ہے، میں تو تم دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا تجھے اور تیری ماں کو کوٹلہ ہرکشن کی زمین داری جو جائیداد مل جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی اتنی خوشی ہوتی کہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔۔۔ پر میری طرح تم دونوں کی بھی کسمت خراب ہے"۔ (۱۲)

تو دوسری طرف محترم احسان شاہ، اس کے سہولت کار نادر خان، پولیس اور عدلیہ کھڑی ہے۔ جاگیر دار جانگلیوں اور کمیوں کے متعلق غیر انسانی رویہ رکھتے ہیں یہ اپنے مزارعوں کی اولاد کو بھی غلام ابنِ غلام بنا کر زندگی جینے پر مجبور کرتے ہیں کردار جمیلہ احسان شاہ کے بارے میں کہتا ہے:

"وہ یہ نہیں چاہتا کہ جانگلیوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر یہ جان لیں کہ وہ جانگلی اور کمی کیوں ہیں۔ اور احسان شاہ کیسے جگیر دار بن گیا؟ انھیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے پرکھے اپنے انگریز حاکموں کے جوتے چاٹتے تھے ان کے سامنے کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔۔۔"۔ (۱۳)

کردار احسان شاہ چڑھتے سورج کا پجاری ہے۔ اس جیسے انسان کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا یہ ہوا کے رخ کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ یہ نظریہ ضرورت کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل یہ تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے خلاف ہوتا ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اپنے گھر پر سبز جھنڈا لگاتا ہے اور مٹھائی تقسیم کرتا ہے۔ ناول میں اس کے بارے میں کردار عالم کہتا ہے:

"نہیں جی! وہ تو سدا یونینسٹ ہے۔ وہ تب بھی یونیسٹ پارٹی میں تھا۔ اس نے پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔۔۔ پاکستان آخر بن ہی گیا۔ پر پاکستان بنتے ہی تیں نوں پتہ ہے شاہ جی نے کیا کیا؟ رحیم داد نے پوچھا وہ جھٹ مسلم لیگی بن گیا اس نے اپنی حویلی پر سبز جھنڈا لگایا۔"۔ (۱۴)

ناول کا اختتام ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

"لالی نے دل گرفتہ ہو کر سوچا، سلیم لودھی واقعی پاگل ہو گیا ہے۔ اوئے بھول جا!

وہ جو کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ اور صرف پاگل اور دیوانہ رہ گیا ہے اسے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے یہ بھی بھول جانا چاہیے کہ وہ لالی سے اب وہ صرف ایک پاگل ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل، جیل کے چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رہ کر اسے سلیم لودھی کی طرح پاگل ہی بن کر رہنا ہو گا۔ یہ ایک ایسا وارڈ ہے جس میں داخل ہونے کا راستہ ہے مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں اس میں قیدی بننے کے بعد رہائی پا کر نہیں نکلتا بلکہ اس کی لاش نکلتی ہے۔۔۔ سلیم لودھی نے ایک بار پھر اونچی تان میں صدا لگائی اوئے بھول جا! ارشاد الٰہی پر یکایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا وہ بے قرار ہو کر اٹھا

اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچ کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے کھنکھار کر فرش پر تھوکا۔۔۔۔۔ بلغم کے ساتھ بہتا بہتا خون کا لوتھڑا بھی نکلا۔۔۔۔۔"۔ (۱۵)

حق کا ساتھ دینے والوں کا اور حق کے لئے آواز اٹھانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے ناول نگار نے نور الہیٰ سلیم لودھی اور لالی کے کرداروں کے ذریعے بخوبی دکھایا ہے۔ بیگم کلثوم بھیک مانگتی تو سلامت رہتی یہاں پر تو اولاد کو مرتے مرتے دیکھنا پڑ رہا ہے اس سے زیادہ دردناک منظر کے علاوہ کون سا منظر ہو گا۔ انسانوں پر مشتمل معاشرے میں شعور و آگہی کی فضا کو برقرار رکھنے والا کردار "پروفیسر لودھی" ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ معاشرتی ناہمواری اور اجتماعی مسائل کی نشاندہی کرنے والا سماجی گھٹن کا شکار ہو کر مینٹل ہسپتال میں بقیہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو دوسری طرف مظلوم کا ساتھ دینے والا "لالی" بے بسی کا شکار ہے۔ اور یہاں جیل میں "چوہدری نور الہی" ایک اذیت کے مرحلے میں ہے۔ اس کے حصے میں خون تھوکنا نصیب ہوا ہے۔ "بیگم کلثوم" سڑکوں پر بھیک مانگ کر زندگی گزار رہی تھی۔ چوہدرائن بننے کے چکر میں زندگی کے اس مقام پر کھڑی ہے کہ اپنے جگر گوشے کو مرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ ناول کا اختتام مظلوم کا ساتھ دینے والے کی بے بسی اور سماجی ناانصافی اور المیے پر ہوتا ہے پروفیسر لودھی کی سزا کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ اوئے بھول جا۔۔۔۔۔ اوئے بھول جا۔۔۔۔۔ اوئے بھول جا۔۔۔۔!

تانیثیت کے مقامی پہلو میں عورت کی شعور بیداری اہم سوالات اٹھاتی ہیں۔ بنیادی حقوق میں زندہ رہنے کا حق، تعلیم کا حق، آمدورفت پر پابندی نہ ہونے، اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے، پسند کی شادی اور بطور انسان سماج میں اپنی سماجی حیثیت کا حق مانگنا بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہیں۔

> "فیمنزم، دنیا کے مختلف ممالک میں ان کے معاشرے، مزاج اور ضروریات کے مطابق شکل اختیار کرتا ہے۔ جس میں خود عورتوں کی تعلیم، شعور، کلاس اور ماحول کا دخل ہوتا ہے۔ عورتیں اپنی جدوجہد کے دوران "پدرشاہی" کو سمجھنے اس سے نجات حاصل کرنے اور ایک غیر استحصالی معاشرہ قائم کرنے کے مراحل سے گزرتی ہیں۔"(۱۶)

حاشیے پر لکھی ہوئی کہانی میں عورت کا استحصال صرف چار دیواری تک محدود نہیں ہوتا ہے۔ چار دیواری سے باہر قدم رکھنے والی عورت کو بھی دہرے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بظاہر آزاد عورت کی مصلحت کے پیچھے نہ نظر آنے والے محرکات ہوتے ہیں۔ غربت، بھوک افلاس اور فرسودہ روایات اس کے خلاف مسلسل حالتِ جنگ میں رہنے والی عورت کو ہر قسم کے حیاتیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جانگلوس میں جائیداد سے بے دخلی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جائداد کی خاطر بڑے بھائی کو ذہنی مریض بنا دیا جاتا ہے۔ شعور کی بیداری کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ان تمام تر انسانی زندگی کو درپیش مشکلات اور مسائل میں عورت کو بنیادی ضروریات زندگی سے ترجیحی بنیادوں پر نظر

انداز کیا جاتا ہے۔ مزارعہ کی حیثیت کیا؟ اور اس کی شریک حیات کی حیثیت کیا؟ جاگیر دارانہ سماج میں گھر کی لونڈی یا مرغی سے کمتر ترجیح دی جاتی ہے۔۔ عورت کو تعلیم کی آزادی پر پابندی، عورت کو ووٹ کی آزادی پر پابندی، آزادئ اظہار پر پابندی کے علاوہ ہر قسم کی صحت مند سرگرمیوں پر پابندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کی عکاسی جانگلوس میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جانگلوس کو صرف دو قیدیوں کی کہانی کہہ کر نظر انداز کرنا ناول اور ناول نگار سے ناانصافی ہو گی۔ حاشیے پر لکھے ہوئے ان نسائی کرداروں کا، شاداں، جمیلہ، نوراں، کلثوم بی بی اور دیگر متاثرہ کرداروں کا انسانی المیہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کشور ناہید، "ادب اور نسائیت"، (مضمون) مشمولہ: خاموشی کی آواز، مرتبین: فاطمہ حسن / آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵

۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ آئندہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹

۳۔ فہمیدہ ریاض، ڈاکٹر، "فیمنزم اور ہم"، (مضمون) مشمولہ: اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ: قاضی عابد، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۶ء، ص ۸

۴۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد اول، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص نمبر ۳۵

۵۔ ایضاً، ص نمبر ۳۵۴

۶۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد سوم، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص نمبر ۶۳۷

۷۔ ایضاً، ص نمبر ۶۴۰۔

۸۔ ایضاً، ص نمبر ۶۵۹۔

۹۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، "جدید اردو نظم کا تانیثی تناظر"، (مضمون) مشمولہ: اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ: قاضی عابد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۱

۱۰۔ ایضاً، ص نمبر ۶۱۰۔۶۱۱

۱۱۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص نمبر ۷۴۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص نمبر ۷۴۳

۱۳۔ ایضاً، ص نمبر ۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص نمبر ۶۳۱

۱۵۔ ایضاً، ص نمبر ۴۳۷۔

۱۶۔ ہارون، انیس، "فیمنزم اور پاکستانی عورت"، (مضمون) مشمولہ: اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ: قاضی عابد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶

References in Roman Script:

1. Kishwar Naheed, "Adab aur Nisaiyat", (Mazmoon) Mashmoola: Khamoshi ki Awaz, Murattibeen: Fatima Hassan/Asif Farrukhi, Wadah Kitabghar, Karachi, 2003, P. 25
2. Najeeba Arif, Dr., Rafta Aainda, Poorab academy, Islamabad, 2008, P. 49
3. Fahmida Riyaz, Dr., "Feminism aur Hum", (Mazmoon), Mashmoola: Urdu Adab aur Tanisiyat, Murattaba: Qazi Abid, Poorab Academy, Islamabad, Taba e Awwal, 2016, P. 8
4. Shaukat Siddiqui, Jangloos, Vol. 1, Kitab Publications, Karachi, 2009, P. 35
5. Ibid. P. 354
6. Shaukat Siddiqui, Jangloos, Vol. 3, Kitab Publications, Karachi, 2006, P 637
7. Ibid. P. 640
8. Ibid. P. 659
9. Nasir Abbas Nayyar, Dr., "Jadeed Urdu Nazm ka Tanisi Tanazur", (Mazmoon) Mashmoola: Urdu Adab aur Tanisiyat, Murattaba: Qazi Abid, Poorab academy, Islamabad, 2016, P. 191
10. Ibid. P. 610-611.
11. Shaukat Siddiqui, Jangloos, Kitab Publications, Karachi, 2009, P 742
12. Ibid. P. 743
13. Ibid. P. 67
14. Ibid. P. 631
15. Ibid. P. 743
16. Haroon Anees, "Feminism aur Pakistani Aurat", (Mazmoon), Mashmoola: Urdu Adab aur Tanisiyat, Murattaba: Qazi Abid, Poorab academy, Islamabad, 2016, P. 26

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.311

ڈاکٹر محمد عامر اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ
ماریہ بلال
لیکچرار، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

اقبال کی فکری سرگزشت: تحقیقی مطالعہ

Dr. Muhammad Amir Iqbal
Assistant Professor, Urdu Department, University of Sialkot
Maria Bilal
Lecturer, Urdu Department, University of Sialkot

Iqbal's Intellectual History: A Research Study

ABSTRACT

Iqbal's intellectual history is full of various qualities. It is difficult to identify the location of Iqbal's thoughts and poems or their sources. What are the main characteristics of Iqbal's mind and thought? What was Iqbal's thinking style? How did Iqbal's mind and thought set evolutionary goals? What was Iqbal's point of view regarding thought and philosophy? And with which chain of thought was his special relationship? The critics of Iqbal believe that he got "Faizan E Nazar" admiration from the East, while there is another group that says that Iqbal's ideas are derived from the West. While some people say that Iqbal's thought and vision do not belong to the East or the West, but his own creation. It may be misleading to conclude by presenting the views of a few critics. This article highlights various aspects of Iqbal's history.

Keywords: *Iqbal, Thoughts, Philosophy, History, culture,*

اقبال صرف شاعر نہ تھے۔ بلکہ ان کا ذہن و نظر مفکرانہ تھا۔ وہ اپنے خیالات پر بھی تدبر و فکر کی نظر ڈالتے تھے اور دوسرے مفکرین کے افکار و آرا پر بھی تنقید و تحسین کے انداز میں غور فکر کرتے تھے۔ اس غور و فکر میں وہ اپنے تصورات کا جائزہ لیتے۔ اقبال نے تفصیل سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کائنات کے ساتھ ساتھ انسانی

Received: 13thFeb, 2023 | Accepted: 10th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

فکر بھی جامد و ساکت نہیں ہے بلکہ لمحہ بہ لمحہ خیالات میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اس تبدیلی کا حوالہ اقبال نے تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ میں بھی دیا ہے۔

> "بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہاں علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے نشو نما پر با احتیاط نظر رکھیں۔ اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں" (۱)

اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کلامِ اقبال کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اقبال کے ذہن میں افکار کا طلاطم موجود تھا مگر فکر کے احساس کو انہوں نے چھپالیا تھا۔ اس کا صحیح طور پر اظہار نہ کر پائے اور خطوط میں اس کمی کا شدت سے اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود واضح ہے کہ فکر اقبال لمحہ بہ لمحہ رواں دواں نظر آتی ہے۔ مطالعہ اقبال سے شغف رکھنے والے قاری ان ارتقائی منازل سے بخوبی آگاہ بھی ہیں۔ ان منازل کی رفتار سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ان سے انکار کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ اقبال کو زندگی میں نہ تو حالات پُر سکون میسر آئے اور نہ ہی زندگی نے زیادہ مہلت تھی۔ اضطراب، بے چینی اور کسک نے چین سے رہنے نہ دیا۔ یہ دکھ رہا کہ کام کرنا چاہتا ہوں وہ نہ کر سکا۔ عاشق حسین بٹالوی کہتے ہیں کہ آخری عمر میں تو یہ احساس شدت پکڑ گیا۔ اپنی تصنیف "اقبال کے آخری دو سال" کے مقدمہ طبعِ اول میں لکھتے ہیں۔

> "اقبال کے دل میں ہمیشہ یہ کسک رہی کہ جو کام اسے کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں کر سکا۔ اور آخری عمر میں تو یہ احساس بہت قوی ہو گیا تھا۔ کلامِ اقبال کا ایک ذہین طالب علم، اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ یہ کسک محسوس کرتا ہے جو بعض اوقات نغمہ و آہنگ کے پردوں کو چیر کر نالہ دل دوز کی صورت اختیار کر گئی ہے"(۲)

اگر اقبال کے شعر و فلسفہ کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے تو غلط فہمیاں قائم رہتی ہیں۔ فلسفہ و شعر کے باہمی امتزاج کی درست تعبیر پیش کرنے کے لیے بہت ہی ذمہ داری اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔ اقبال کے سلسلے میں یہ ذمہ داری مزید اہم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اقبال کے یہاں بہت سے وسیع اور متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں۔ جب ہم اقبال کے فکر و ذہن کا مطالعہ کرتے ہیں تو چند حقیقتیں سامنے آتی ہیں اور یہ حقائق مطالعہ اقبال کے سلسلے میں بنیادی طور پر دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ ان کا تعلق مفروضات سے نہیں بلکہ حقائق سے ہے۔ فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے اقبال کی نظر میں فکر و فلسفہ کی پوری تاریخ ہے۔ اس تاریخ نے کتنے موڑ لیے ہیں اور کتنے دھارے

بدلے ہیں۔ اقبال کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ تاریخِ فلسفہ میں قطعیت کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ ماضی کی شان دار روایات کا سہارا لیتے تھے اور ہر زمانے میں فکر و نظر کا نیا محل تعمیر کرتے تھے۔

اقبال کے نزدیک جمود اور سکوت ہلاکت اور تباہی کا موجب تھا۔ ماضی کے فکر و نظر حال میں کالعدم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کے افکار میں تبدیلی رونما ہو جائے بلکہ اسے ارتقاء کا نام دے سکتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتا رہتا ہے اور انسان آگے کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات کے تمام مباحث کو فلسفیانہ قرار دیا اور کہا تھا کہ فلسفہ ایک متحرک چیز ہے۔ اقبال کے خطبات تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ کا مطالعہ کریں تو اس کے دیباچے میں ان فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو سے پہلے لکھا تھا کہ فلسفہ میں کوئی چیز قطعی اور آخری قرار نہیں دی جاسکتی۔ فلسفہ ایک متحرک چیز ہے۔ اقبال نے ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کیا۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ قوتِ عمل ہوتی ہے اور انقلاب برپا کرنے کے لیے قوتِ عمل کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ فکر و عمل کا کوئی بھی دستور اور کوئی بھی پیغام موثر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں قوتِ عمل کی تاثیر نہ پائی جاتی ہو۔ اقبال نے خاص وجوہات کی بنا پر نوجوان نسل سے خطاب کیا اور انقلاب کے لیے بیدار کیا۔ ایک پژمردہ اور زوال پذیر معاشرے کے نوجوانوں کو بیدار کرنا آسان کام نہ تھا جو اقبال نے کر دکھایا۔

اقبال خود بھی اپنے دل و دماغ کی سرگزشت لکھنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ سرگزشت ان کے کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اقبال یہ بھی خیال کرتے تھے کہ اس سرگزشت سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ ناقدینِ اقبال اب تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ اقبال شاعر ہیں یا مفکر۔ ایک گروہ اقبال کو شاعر کہتا ہے اور دوسرا گروہ اقبال کو مفکر مان کر اہمیت دیتا ہے۔ کچھ لوگ اقبال کو شاعر بھی مانتے ہیں اور مفکر بھی۔ اقبال کی شاعری میں ایک نصب العین سے وفاداری کا سبق ملتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

> "اقبال کی شاعری اور ان کا شعری نظریہ ایک بلند نصب العین سے وفاداری کا ہے۔ اس بلند وفاداری اور اس کے تقاضوں کی وجہ سے ان کے نزدیک زندگی ایک مہم اور شاعری اس مہم کو سر کرنے کی ایک کنجی بن گئی"(۳)

بہت سے ایسے ناقدین کے حوالے ملتے ہیں جو اقبال کو شاعر، مفکر اور فلسفی تسلیم کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعرانہ اور مفکرانہ دونوں حیثیتوں کو خود ہی تسلیم بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ(۴)

اقبال کے وہ اشعار جو فلسفیانہ افکار و آرا کے متحمل ہیں ان میں شاعرانہ رنگ بھی ہے اور موسیقیت بھی ان میں نغمگی بھی ہے اور اظہار و ابلاغ کی نازک ترین لطافتیں بھی۔ ان حالات میں اسلوب کی اہمیت نہیں رہتی بلکہ موضوع زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات تو درست ہے کہ ادب میں اسلوب کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مگر اقبال کے نزدیک موضوع زیادہ اہم ہے۔ اقبال نے اسلوب کے باعث فنِ شاعری سے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن اگر حکیمانہ اور فلسفیانہ افکار کی تبلیغ و تفسیر کے لیے شاعرانہ اسلوب بہتر نظر آتا ہو تو شاعری سے پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کا مقصد بھی پیغام دینا ہی ہے۔ اس لیے اقبال واعظ بھی محسوس ہوتے ہیں اور یہ واعظانہ رنگ اسلوب پسندوں کو گراں گزرتا ہے۔ اقبال کے ہاں فکر و فن جب یکجا ہوتا ہے تو پیکر بن جاتا ہے۔ اس طرح اقبال کے ہاں پیکر تراشی کے کئی مرقعے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یہ تو فکرِ اقبال کا ایک پہلو تھا مگر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اشعار کو خوبصورت بنانے کے لیے حسین الفاظ درکار ہوتے ہیں۔ فکر چاہے جو بھی ہو اسے دلکش انداز میں پیش کرنے کے لیے بھی فن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی فن پڑھنے والوں کی زبان پر چڑھتا ہے۔ نغمگی پاتا ہے، سمجھ میں آتا ہے اور فکر بن جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار کو خوبصورت بنانے کے لیے خوبصورت پیکر بھی تراشے اور مصوری بھی کی۔ اس کی مثالیں کثرت سے دیکھی بھی جا سکتی ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے اشعار کی اصلاح بھی کرتے رہے۔ ان میں شعر کہنے کی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ ماہرینِ اقبال کہتے ہیں۔

> ”میرا خیال ہے کہ اقبال کے کلام کا ایک چوتھائی حصہ محض آورد کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے اشعار کو بھی آمد سمجھ لیا جائے۔ ورنہ اس چوتھائی کلام کو ذہن و فکر پر زور دے کر قلم بند کیا گیا ہے۔ چوں کہ اقبال کی طبیعت میں شعر گوئی کا ملکہ بدرجہ اتم موجود تھا اس لیے بھی کبھی کبھی ان کی یہ کیفیت عام قاری کو دھوکا بھی دے جاتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی شخصیت بہت ہی تہ دار اور معنی خیز ہے۔ فکر و فلسفہ، شعر و فن، مقصد و پیغام کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ اقبال کے علاوہ دوسری جگہ اس کی نظیریں بہت ہی مشکل سے ملتی ہیں۔ یہ اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کا کمال ہے۔ انہوں نے فلسفہ کی بے جان، خشک، منطقی استدلال و مباحث کو شعر و فن کے نازک ترین مرقعوں میں پیش کر کے دونوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔ فلسفۂ شعر کی یہ آمیزش اقبال کی فسوں کاریوں کی انفرادیت کی ضامن ہے“(۵)

ہمیں فکر اور سوچ کی راہوں پر پابندی نہیں لگانی چاہیے۔ اس سے تنقید اور تبصرے کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی ہمیں افہام و تفہیم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور نہ ہی کوئی حکم صادر کرنا چاہیے۔ اقبال کی حمایت میں لکھنے

والے مصنفین نے کہیں کہیں یہ رویہ اختیار بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی تصانیف اقبال کی مدح سرائی میں لکھی گئی ہیں۔

فکرِ اقبال جہاں ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی وہاں زندگی کے مختلف افق بھی اس کے سامنے عیاں ہوتے رہے۔ ارتقا کے اس عمل میں کچھ ایسے مفکرین بھی سامنے آتے ہیں جن کے نظریات پر اقبال نے شدت سے تنقید کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے بھی فکرِ اقبال پر اور اقبال کے فکر میں تضاد پر خاص تنقید کی ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے میکش اکبر آبادی کے دو مضامین کی بات کی ہے جن کا عنوان۔ ''علامہ اقبال کے متضاد نظریے'' تھا۔ پھر ان مضامین کے جواب میں پروفیسر تاثیر اور غلام محمد بٹ نے مضمون لکھے اور ساتھ ہی بشیر مخفی القادری نے بھی تردیدی مضامین لکھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی اس حوالے سے مضمون لکھا۔

اقبال انتہائی ذہین تھے تو حساس بھی تھے۔ خواجہ حافظ، عرفی، مرزا بیدل سب میں اقبال حرکت کا رویہ ضرور دیکھتے تھے۔ اگر انہیں ایسا کوئی رویہ نظر نہیں آتا تو وہ ان افراد سے برات کا اعلان بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چند نقاد اقبال کے فکر و فن پر سوالیہ نشان ڈالتے ہیں۔ کچھ نقاد کہتے ہیں کہ اقبال کے فکر و فن میں تضاد پایا جاتا ہے۔

فراق گورکھپوری تو فکر و فن کیا، اقبال پر تنقید میں حد سے ہی گزر گئے۔ فراق گورکھپوری عشقیہ شاعری میں تو باکمال ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تنقید کا میدان، ان کی دسترس میں نہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کے فکر میں حجاز کا غلبہ تھا۔ اقبال کی فکر میں عقاب، شاہین اور شہباز وغیرہ کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ فراق گورکھپوری انہیں صرف سفاک جانور ہی سمجھتے تھے۔ ان کی بصیرت کبھی ان پرندوں کی بلند پروازی، درویشی تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اقبال کا شعر ہے۔

چو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر! وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں (۶)

فراق گورکھپوری اقبال کے اس شعر سے خوفزدہ ہو کر شاید قبال کے فکر میں تضاد کا دعویٰ کرتے تھے۔ علی سردار جعفری کے نزدیک اقبال اور مسولینی کے نظریات میں مماثلت تھی یعنی دونوں جنگ کو لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ سمجھتے تھے۔ علی سردار جعفری نے مسولینی کے جنگ کے رویے کو اقبال کے لہو گرم رکھنے کے رویے سے ملایا ہے۔ حیرت ہے علی سردار جعفری جیسا دانا و بینا ادیب مگر مسولینی اور اقبال کے فکر و فن میں فرق ہی نہ کر سکا۔

اختر حسین رائے پوری بھی اقبال کے فکر و فن کی گہرائی سمجھنے سے مکمل طور پر قاصر رہے اس لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کہتے رہے۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک مسولینی وہ شخص ہے جو اطالیہ کی بہبود کے لیے پوری دنیا کو فنا کر سکتا تھا، وہ سرمایہ داروں کا سپہ سالار تھا۔ اس کے لیے جنگ انسانیت کے لیے شیر مادر تھی۔ ایسا شخص انسان نہیں آمر ہوا کرتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک ایسا آمر ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا

ضامن ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ضد میں یہ بات کہہ دی۔ اس بات میں تحقیق و تنقید کے ساتھ مطالعہ کا فقدان نظر آتا ہے۔ علی سردار جعفری نے اقبال کے فکر و فن پر تضاد کے حوالہ سے کہا:

"وہ اپنی شاعری میں جس حسین و جمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے تھے ان کا فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد کرتا ہے"(۷)

درج بالا ماہرین نے اقبال کا فلسفۂ حرکت و عمل پسند نہیں کیا اور ان تحریروں سے لگتا ہے کہ اقبال کا فلسفہ مردِ مومن بھی شاید انہیں نہ بھایا۔ اگر فکرِ اقبال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہر طرح سے توازن بھی ہے اور ہم آہنگی بھی۔ اقبال کے افکار و نظریات میں کہیں تصادم نظر نہیں آتا۔ یہ ہم آہنگی اتفاقی نہیں بلکہ باقاعدہ اس ہم آہنگی کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اقبال کو ذہنی اور فکری بصیرت کا پورا احساس تھا۔

فراق گورکھپوری کا خیال مکمل طور پر باطل ہے۔ اقبال کے ہاں شاہین کی علامت خودداری، بلند پروازی، غیرت مندی، زمین سے بے تعلقی اور خلوت نشینی سے متصف ہے اس طرح اور بھی ہیں جیسے کُنجشک فرومایہ وغیرہ۔ اس طرح اقبال کے فکر و فن میں متضاد الفاظ اور شخصیات کا ذخیرہ ضرور ملے گا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال کے فکر و فن میں بھی تضاد پایا جاتا ہو۔

اقبال نے اس قومیت کی بھی مخالفت کی ہے جو انسان کی تخلیق کردہ ہے۔ اس قومیت کی حدود بھی ہیں جن کی بنیاد علاقہ، جغرافیہ اور سیاست پر مشتمل ہے۔ اقبال قومیت کو زمین کی حدود میں قید نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ساری زمین کو ایک قومیت اور تمام بنی نوع انسان کو ایک قوم سمجھتے تھے اور اس بنی نوع انسان کے لیے ایک مرکزِ محسوس کو بھی لازم قرار دیتے ہیں اور یہ مرکز مخصوص کرہ ارض پر ہی ہو سکتا ہے کہیں خلا میں نہیں۔ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں اپنے تمام تر خیالات کا اظہار واضح طور پر کیا ہے۔ اقبال کا "شاعری ترک کرنے" کی بات کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہ شاعری کی الف ب سے واقف نہیں۔ اقبال نے شاعرانہ رنگ میں بھی اپنے فکر و فلسفہ کا بخوبی اظہار کیا ہے اور اپنی نثر میں بھی۔ ہمیں اقبال کی شاعری اور اقبال کی نثر سے اقبال کی فکر کے ایک ایک سنگ ریزے کو سمیٹنا ہو گا۔

اقبال پر زندگی میں بھی تنقید ہوئی، مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر دیکھا جائے تو اقبال کے فلسفۂ خودی کی اپنی اہمیت ہے۔ وہ لوگ جو اقبال کے مخالف تھے انہوں نے پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ اقبال کی خودی پر عمل پیرا لوگ جنگ و جدل کے عادی ہوتے ہیں۔ مخالفین کے نزدیک وہ فاشسٹ اور آمر بن جاتے ہیں۔ حالانکہ اقبال کی خودی کا سب سے بڑا پیکر حضرت رسالت مآبؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اقبال کی نظر میں یہی ذات تھی جو خودی اور بے خودی کی تمام تر صفات سے متصف تھی اور انسان کامل کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اقبال مردِ مومن کی جو صفات بیان کرتے ہیں انہیں اسرارِ خودی کے ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ای سوارِ اشہب دوراں بیا　　ای فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدۂ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن　　نغمۂ خود را بہشت گوش کن
از در عالم بیار ایامِ صلح　　جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح(۸)

اقبال اسے بلا رہا ہے جو زمانے کے گھوڑے پر سوار ہے جو کائنات کی آنکھوں کا نور ہے۔ وہی ذات ہے جو موجوداتِ عالم میں رونق پیدا کرے گی۔ وہی ذات ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ دنیا میں قوموں نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس ہنگامے کو خاموش کر دے۔ اپنے نغمے کو انسانوں کے لیے جنت کی تازگی عطا فرما دے۔ بھائی چارے کا سُر چھیڑ۔ بھائی چارے کی فضا پھر سے عام کر دے۔ دنیا میں امن اور صلح کا ماحول عام کر دے۔ جنگجوؤں کو صلح کی طرف راغب کر دے۔ یہی انسان کامل کی خوبیاں ہیں یہ صفات پیدا ہوں گی تو وہ خودی کے بلند مقام تک جا پہنچے گا۔ اس طرح وہ خود کو ملت کے لیے قربان کر دے گا۔ اس طرح اقبال کا فلسفۂ بے خودی جنم لیتا ہے۔ مفکرین کہتے ہیں۔

> "اقبال نے خودی کے ساتھ ساتھ بے خودی کو لازم قرار دیا ہے تاکہ فرد کی انا پورے معاشرے کو فنا نہ کر دے۔ فرد کی انا کو جماعت کی انا کے ساتھ ربط باہم کے رشتوں میں مضبوط کر دیا گیا ہے۔ تاکہ فرد کی انانیت آمر و جابر نہ بن سکے۔ ورنہ جماعت اور فرد دونوں تباہ ہو کر انسانیت کے لیے سوہان روح ہو جائیں گے۔ اقبال اس حقیقت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے خودی کو بے خودی کا جزو لاینفک قرار دیا ہے"(۹)

اقبال کے فلسفۂ عقل و عشق بھی گوناں گوں صفات سے مزیّن ہے۔ اس کی معرکہ آرائیاں دورِ قدیم سے ہی مشرق و مغرب میں جاری ہیں۔ اقبال عقل کے مقابلے میں عشق کو زیادہ اہمیت دیتے تھے مگر عقل کی عظمتوں سے بھی مکمل انکار نہ کرتے تھے۔ یہ فکر کا تضاد نہیں بلکہ خیال کی وسعت ہے۔ اقبال دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم قرار دیتے تھے۔ عقل جب ترقی کی انتہائی منزل تک پہنچتا ہے تو اقبال کے نزدیک وہ عشق بن جاتا ہے۔ اس طرح فکرِ اقبال کے تفصیلی مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس میں افکار کا تضاد یا عدم توازن نہیں بلکہ ارتقا ہے جو خاص توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

عشق کا تصور ایرانی اور عربی شعرا سے ماخوذ تھا مگر اقبال نے اسے جدید فکر و نظر عطا کی جس سے عشق کو نیا آہنگ میسر آیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اقبال نے مملکت کا کوئی واضح تصور نہیں پیش کیا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اقبال کی تحریروں اور اشعار سے جو عکس نظر آتے ہیں ان سے یہ نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال نے قدیم علوم سے استفادہ بھی کیا اور جدید علوم کا مطالعہ بھی کیا۔ اس کے باوجود اقبال کے افکار کی افادیت اور انفرادیت اپنی جگہ قائم

ہے۔ مثلاً اگر ہم ان کے خطبات کا جائزہ لیں تو اقبال نے اسلامی مفکرین کی پیدا کردہ موشگافیوں کا سنجیدگی سے حل پیش کیا ہے۔ اسلامی مفکرین یونان اور افلاطونی فلسفہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ اس طرح فکرِ اسلامی فلسفۂ یونان کی پیدا کردہ نئی شکل بن کر سامنے آتی ہے۔ یوں تو جیہات اور تاویلات کے گروہ در گروہ نظامِ فکر پیدا ہو گئے۔ اسلام کی صحیح صورت مسخ ہو گئی۔ پھر اقبال کا ارتقائی عمل پروان چڑھا اور یہی اقبال کی انفرادیت ہے۔ اس طرح اقبال کا ذہنی اور فکری توازن بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ہر جگہ قائم ہے۔ خودی سے بے خودی ہو، عقل و عشق ہو، قومیت و بین الاقوامیت ہو، مشرق و مغرب ہو، جدید و قدیم اندازِ حیات ہو۔ یہ توازن ہر جگہ قائم ہے۔ اس لیے یہ کہنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے کہ اقبال کے فکر میں توازن نہیں پایا جاتا۔ اگر اقبال کی فکری سرگزشت کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ارتقا کے مرحلوں سے گزرتی ہے اور ہمیں زندگی کی نئی راہیں دکھاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فکرِ اقبال جمود کا شکار ہو جائے اور جمود دراصل موت کی علامت ہے اور حرکت زندگی کا پیغام ہے۔ یہی حرکت اجتہاد کی ابتدا ہے اور اجتہاد ہی قوموں کی زندگی کے لیے ناگزیر ہوا کرتا ہے۔

اقبال کی فکری سرگزشت گوناگوں صفات سے لب ریز ہے۔ اس سرگزشت کے پیچ و خم کو سمجھے بغیر اقبال کے افکار و اشعار کا مقام یا ان کے سرچشموں کی نشان دہی مشکل ہے۔ اقبال کو ہر دور میں آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان کے نزدیک اس فکری سرگزشت کی روداد لوگوں کے لیے سبق آموز اور مفید ہے۔ اقبال کے جہاں دیگر منصوبے نامکمل رہے وہاں یہ منصوبہ بھی تکمیل تک نہ پہنچ سکا کہ وہ اپنی سرگزشت کو ترتیب دے سکیں۔ ان کے دوسرے دور کی سرگزشت کے نتائج دور رس اور گہری معنویت کے حامل ہیں۔ یہ دور قیامِ یورپ سے ۱۹۱۱ء تک کا دور ہے۔ وہ جتنا عرصہ یورپ میں رہے تب تک بساطِ فکر متزلزل رہی۔ اقبال یورپ جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ وہ سازگار حالات کی تلاش میں تھے۔ سفر کے لیے کچھ رقم تو اقبال نے خود اکٹھی کر لی تھی اور پھر بڑے بھائی شیخ عبداللہ نے بھی معاونت فرمائی مشکلات کے وقت اقبال کے فکر و نظر کی صحیح تربیت میں ان کے بڑے بھائی نے قابل ذکر کردار ادا کیا۔ اقبال کے اس دور پر نگاہ ڈالیں تو کبھی کبھی اقبال عالمِ استغراق میں بھی نظر آئیں گے جسے دیکھ کر دوسرے حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب اقبال حافظ کے مداح تھے اور فکری طور پر بھی اس کے قریب تھے۔ کبھی کبھی تو ایسی حالت بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اقبال خود حافظ شیرازی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سعدی شیرازی کی روح اقبال میں حلول کر گئی تھی اور حافظ کی شاعری کے منفی پہلوؤں کے اثرات ابھی اقبال کے سامنے نہیں آئے تھے۔

قیامِ یورپ کی بات کریں تو اس مختصر قیام نے اقبال کے فکر میں جو سب سے بڑی تبدیلی پیدا کی وہ وطنیت کی مخالفت تھی۔ اقبال اس سے بہت بیزار تھے اور کبھی اس سے مفاہمت نہ کر سکے۔ اقبال نے اس وطنیت کو مغرب کا

پُر فریب تصور کہا جس سے اقبال نے پہلے ہی بنی نوع انسان کو آگاہ کر دیا تھا۔ فکرِ اقبال میں زندگی کا نصب العین بھی یہی تھا۔ صرف اقبال ہی وہ ماہر اور اپنے مقصد سے مخلص ہے جس نے انسانی اتحاد کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ ساتھ شدید مزاحمت سے کام لیا۔ اس دور میں اقبال کی زندگی کا ہیجان انگیز دور بھی سامنے آتا ہے مگر اس دور میں بھی آپ کے فکر و فلسفہ پر کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے اس دور میں آپ نے چند نظریات ایک ڈائری میں محفوظ بھی کیے جو بعد میں سامنے آئے۔ یہ اقبال کے فکر و فلسفہ کا جوہر ہیں۔

اقبال کی شخصیت، فکری سرگذشت اور تخلیق کے سرچشموں کے مطالعہ بہت ہی نتیجہ خیز اور دلچسپ ہے۔ اقبال کی فکری سرگذشت پر غور کرنا لازم ہے۔ انہیں زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف ذہنی کیفیات سے گزرنا پڑا۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ اقبال کی فکری سرگذشت کی نشاندہی کریں۔ اقبال کی سرگذشت صرف شاعری میں ہی نہیں دیگر تحریروں میں بھی بکھری پڑی ہے۔

اقبال کے فکر و فن کا اہم دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء کا زمانہ ہے۔ اس کا درمیانی دور اقبال کے لیے بہت تکلیف دہ دور تھا۔ اس دوران انہوں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ گھریلو حالات بھی بہتر نہ تھے۔ دل کا سکون بھی نصیب نہ تھا۔ اقبال کا ابتدائی دور ۱۹۰۵ء یعنی یورپ جانے سے پہلے کا زمانہ ہے۔ دوسرا ۱۹۱۱ء تک جس میں قیامِ یورپ بھی شامل ہے اس دور کو توسیع دیتے ہوئے اسے ۱۹۱۴ء تک کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک بذاتِ خود ایک دور ہے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ اسرار و رموز کا زمانہ ہے۔ اسے تیسرا دور قرار دیا جا سکتا ہے اور اس پر بحث علیحدہ توضیحات پر مشتمل ہونی چاہیے۔ ہم یہاں صرف دوسرے دور کو سامنے رکھتے ہیں۔ یورپ میں تین سال کا مختصر قیام پھر واپسی اس دوران اقبال کے ذہن میں کیا تلاطم برپا تھا۔ یہ سمجھنے کے لیے چار ماخذ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا ماخذ ان کتب کو قرار دیا جا سکتا ہے جو اقبال کی سوانح سے متعلق ہیں۔ سب سے مستند بیگم عطیہ کی ڈائری ہے۔ دوسرا ماخذ اس دور کی شاعری ہے۔ تیسرا ماخذ عطیہ فیضی کو لکھے گئے نجی خطوط ہیں۔ جن میں عجیب و غریب کیفیات قلم بند ہیں۔ چوتھا ماخذ اقبال کی اپنی ڈائری ہے۔ جسے ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۱ء میں Stray Reflections کے نام سے شائع کرایا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پاکستان سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ۱۹۷۳ء میں "شذراتِ فکرِ اقبال" کے عنوان سے پروفیسر عبدالحق نے اضافے کے ساتھ ہندوستان سے "بکھرے خیالات" کے نام سے چار مرتبہ اور میاں ساجد علی نے پاکستان میں "منتشر خیالاتِ اقبال" کے نام سے شائع کیا ہے۔

علم کی پیاس کا احساس اقبال کے یہاں ہر دور میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینی کالج میں داخلہ لیا۔ اقبال یورپ گئے تو مستشرقین اساتذہ نے فارسی ادب، تصوف اور مولانا روم کے گہرے مطالعے کی طرف اقبال کو راغب کیا۔ اس سے اقبال کے فکر و شعور پر دیرپا نقش ثبت ہو گئے۔ یورپ میں اقبال علمی

کاموں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اصلاحی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح وہ حالات کے نبض شناس اور خاموش مدبر بھی بن گئے۔ یورپ کے مختصر قیام کے دوران وہ جہاں فطرت کے مناظر سے متاثر ہوئے وہاں انسانی حسن سے بھی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس حسن کو فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں کہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حسن کی بھی حقیقت کیا ہے؟

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی　　وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی[۱۰]

بات آگے بڑھتی ہے۔ اقبال کے فکر و نظر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ اقبال کے ارد گرد افراد تو ہیں مگر اقبال خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ تنہائی کا شکار ہیں۔ اقبال کے سوز و ساز میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نگاہِ بصیرت نے دیکھ لیا خاموشی ٹوٹ گئی۔ ریت کے تودے پر کھڑی مغرب کی بودی اور کمزور تہذیب سب سے پہلے ہدفِ ملامت بنتی ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب پر تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس طرح آپ ایک پیام بر بن گئے۔ یورپ میں قیام کے دوران شاعری ترک کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے اساتذہ نے روک دیا اور شاعری کو وسیلۂ اظہار بنانے کا مشورہ دیا۔

اقبال نے اپنی شاعری سے حرکت و عمل کا پیغام بھی دیا۔ اقبال نے پورے یورپ میں دیکھا کہ وہاں اسلاف کی گراں قدر اور علمی میراث محفوظ ہے۔ جرمنی جا کر اقبال پر علم و دانش کے نئے در کھلتے ہیں۔ اپنے مقالے کی تیاری کے دوران علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ غرضیکہ یورپ قیام کے دوران اقبال نے علم کے حصول میں شدید محنت اور لگن سے کام لیا۔ یورپ سے واپس آئے تو اقبال کی ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ پہلی بیوی سے مطمئن نہ تھے لیکن رسم و رواج کے بندھن توڑنا اتنا آسان نہ تھا۔ عطیہ فیضی کو بار بار خط لکھ رہے ہیں۔ اپنی زندگی کے حالات کا قصہ بیان کر رہے ہیں۔ ایک طرف طبیعت میں ایسا طوفان برپا ہے کہ ایک پل کو چین نہیں۔ اقبال نے خطوط میں لکھا ہے کہ میں پہلی شادی سے مطمئن نہیں۔ اقبال جس بیوی کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے اس کا تعارف کچھ یہ ہے۔

> "یہ مقدس بیوی سرزمینِ حجاز میں پیدا ہوئیں اور دس سال تک اپنے والد بزرگ کے ہمراہ وہیں قیام پذیر رہیں۔ اور بارہا انہیں حج کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان بیوی کی اور علامہ کی خوشدا من کی دوسری زبان عربی تھی۔ ماں بیٹیاں بے تکان عربی بولتی تھیں۔ قابل باپ نے شریفانہ پردہ کی قید کے اندر دینی تعلیم کے زیور سے اپنی بیٹی کو خوب آراستہ کیا تھا یہ بیوی صبر و شکر اطاعت گذاری اور سلیقہ شعاری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کا نام نامی کریم بی بی تھا"[۱۱]

حافظ سید حامد جلالی کی کتاب علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس میں کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپ قیام کے دوران اقبال عطیہ فیضی سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ عطیہ فیضی ہی تھی جو اقبال کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر وجدانی کیفیت سے دنیاوی کیفیت میں واپس لانے کی جرات کر سکتی تھی۔ اس دور میں اقبال کے ذہن پر بھی عطیہ فیضی ہی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کیفیت سے نکلنے میں اقبال کو کچھ وقت ضرور لگا۔ اس کے باوجود اقبال فکر و فلسفہ کی تبلیغ میں موثر کردار ادا کرتے رہے۔

اقبال کی سرگذشت کے اس دور میں سیاست کے میدان میں بھی اقبال کے متحرک ہو جانے کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ تقسیمِ بنگال ہو یا ترکی کی خلافت، اقبال کی نظر سب پر تھی۔ ان تمام حالات کے باعث فکرِ اقبال نے اپنا راستہ متعین کر لیا تھا۔ نظموں کی شکل میں اقبال اپنے خیالات کا اظہار کیے جا رہے تھے۔

اسلام سے اقبال کا تعلق جذباتی نہیں۔ اسلام کو اقبال چراغِ راہ گزر قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے درد ناک نظمیں لکھ کر لوگوں کے دلوں میں اسلام کا جذبہ بیدار کیا۔ اقبال کے مآخذ میں اقبال کی ڈائری کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس میں بہت سی فلسفیانہ سرگوشیاں موجود ہیں۔ اقبال کا ذہن ہر دور میں حقائق کے ادراک میں مصروف رہتا تھا۔ وہ سماجی بہبود سے بھی بے خبر نہ تھے۔ پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں۔

> ''فکرِ اقبال سماجی بہبود کے مختلف نظام اور ان کے طریق ہائے فکر پر بھی متوجہ ہے۔ قومیت کے علاوہ وجودِ باری تعالیٰ، طرزِ حکومت، سرپرستی، اقوام، جدید سائنس اور جمہوریت، سفید فام کا ہار، اقلیتوں کی طاقت، جمہوریت اور شہنشایت وغیرہ موضوعات ہیں۔ ان کی فکر کے مرکزی دھارے کی رفتار اور رخ کا پتا چلتا ہے''(۱۲)

اس کے بعد کا دور دیکھیں تو فکر دو راہوں پر چلتی نظر آئے گی۔ کہیں متوازی اور کہیں مخالف۔ یہ بھی اقبال ہی کا فن ہے۔ ۱۹۱۰ء میں ترکِ شعر کے لیے آمادہ ہیں اور بیاض میں شعرا کی تعریف کے پل باندھے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد آخری دور میں ہیجان کی کیفیت دور ہوتی ہے۔ دوسری شادی سے زندگی میں سکون آتا ہے۔ والدہ جاوید سے پہلے لدھیانہ میں تیسری شادی ہوئی۔ پھر کچھ دنوں بعد غلط فہمیاں دور ہوئیں تو سردار بیگم بھی گھر آ گئیں۔ اس طرح اقبال زندگی کے میدان میں رواں دواں رہے۔ اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے امتِ مسلمہ کو بیدار کیا۔ ہندوستان کے باسیوں نے اس آفتاب کی ضو سے اپنے وطن کو روشن کیا۔ پاکستان کے باشندے اپنے لیے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ کسی ایک کا کوئی قبضہ نہیں بلکہ اگر کوئی قبضہ کرے اور اقبال کو اپنا کہے تو سمجھ لو کہ وہ اقبال کو محدود کر رہا ہے۔ اقبال سب کے لیے ہے۔ اقبال کا فکر و فلسفہ سب کے لیے ہے۔ اقبال کے فکر و فلسفہ میں ارتقا مختلف ادوار میں آتا رہا جس کے چار مآخذ بیان کیے گئے ہیں۔ اقبال کی سرگذشت کا مطالعہ اقبالیات کے قاری کو فکرِ اقبال کے نکات پر تحقیق و تنقید کی دعوت فراہم کرتا ہے۔ اس طرح فکرِ اقبال کے دامن میں وسعت پیدا ہو گی اور اقبالیات کی راہیں کشادہ ہوں گی۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجم، سید نذیر نیازی، لاہور: بزم اقبال۔ ۲ کلب روڈ، اشاعت پنجم ص ۳۶

۲۔ بٹالوی، عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال، لاہور: سنگ میل۔ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء صفحہ ۱۷

۳۔ سرور، آل احمد، پروفیسر، اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جنوری ۱۹۹۹ء ص ۸

۴۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بال جبریل، غزل ۲۸، ص ۳۸۱

۵۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال کے ابتدائی افکار، فکری سرگزشت، دہلی: جمال پرنٹنگ پریس، نقش اول ۱۹۶۹ء مارچ ص ۲۷

۶۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بال جبریل، نصیحت، ص ۴۴۸

۷۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال کے ابتدائی افکار، فکری سرگزشت، ص ۳۵

۸۔ اقبال، اسرار خودی، ترتیب، شائستہ خان، فراموش شدہ، ایڈیشن، نئی دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، پہلی بار فروری ۱۹۹۳ء، ص ۸۶

۹۔ عبدالحق، پروفیسر، اقبال کے ابتدائی افکار، فکری سرگزشت، ص ۵۱

۱۰۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بانگ درا، حقیقت حسن، ص ۱۳۸

۱۱۔ حامد جلالی، حافظ، سید، علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہائوس، ۱۹۹۸ء ص ۱۲۴

۱۲۔ عبدالحق، پروفیسر، تنقید اقبال اور دوسرے مضامین، ص ۵۳

References in Roman Script:

1. Iqbal, Tashkeel jaded ilahiyat e islamia, mutarjam, syed Nazir Niazi, Bazm e Iqbal Lahore, ishaat punjam, p,36
2. Batalwi, ashiq hussain, Iqbal ky akhri do saal, sung e meel, Lahore, 2009, p,17
3. Suroor, Aal ahmed, professor, aqbal ka nazria e she'r aur un ki shayari, maktaba jameya Limited, dehli, 1999, p,8
4. Iqbal, kuliyat e Iqbal urdu, baal e jibreel, p,381
5. Abdul haq, professor, Iqbal k ibtidai afkaar, fikri sar guzasht, jamal printing press, dehli, naqsh awal, 1969, p,27
6. Iqbal, kuliyat e Iqbal urdu, baal e jibreel, p,448
7. Abdul haq, professor, Iqbal k ibtidai afkaar, fikri sar guzasht, p35
8. Iqbal, asraar e khudi, muratab shaista Khan, maktab e jameya dehli, 1993, p86
9. Abdul haq, professor, Iqbal k ibtidai afkaar, fikri sar guzasht, p51
10. Iqbal, kuliyat e Iqbal urdu, bang e dara, p138
11. Hamid jalali, Hafiz, syed, allam Iqbal ki azdwaji zindgi, educational paublishing house, dehli, 1994, p124
12. Abdulhaq, professor, tanqeed e Iqbal awr dusray mazameen, p53

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.308

ڈاکٹر وجیہہ شاہین
لیکچرار اردو(جزوقتی)،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد
ڈاکٹر قمر عباس
اسسٹنٹ پروفیسر اردو(جزوقتی)،این سی بی اے اینڈ ای،ملتان کیمپس

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم نگاری

Dr. Wajeeha Shaheen
Lecturer Urdu (visiting),Islamic International University, Islamabad
Dr. Qamar Abbas
Assistant Professor Urdu (visiting), NCBA&E, Multan Campus

Dr. Tahir Taunsvi's Art of Poem Writing

ABSTRACT

Dr. Tahir Taunsvi is a distinguished researcher, critic and poet of Urdu language and literature. The most important aspect of his literary work is based on research and criticism. He made useful contributions in the field of Urdu poetry as well. His poetry book "تو۔۔۔طے ہوانا" was published by "Bazam e Elam o Fun Pakistan" in 2001 AD. This book consists of impressive poems, poetics (غزلیات), "Hamd", "Naat", "Manqabat" and "Slaam". His poems connect the readers to the tradition of Urdu poetry. It also reflects the modern themes and styles. In his poems he expresses great love for Prophet Muhammad (PBUH), his sacred family and Islamic culture. His poems also reflect the themes of love, great human values and historical consciousness. In this article, the author has presented a brief evaluation of his poetry with reference to his poems.

Keywords: *Distinguished, Critics, Poetics, Traditions, culture,*

شاعری اپنے عہد سے مکمل آگہی کا ذریعہ ہوتی ہے۔غزل کی بہ نسبت نظم میں شاعر اپنی بات کو قاری اور سامع تک بہتر انداز میں پہنچا سکتا ہے۔اسکی ایک وجہ غزل میں ہیئت کی پابندی اور ردیف قافیہ کا التزام ہے جو شاعر کو محدود کرتا ہے۔اس کے برعکس نظم اس طور کی پابندی سے آزاد ہے۔ نظم میں شاعر اپنے جذبے اور احساس کو براہ راست بیان کر سکتا ہے جبکہ غزل میں اسے اس طرح کی سہولت نہیں ہوتی اور ردیف قافیہ کی پابندی شاعرانہ

Received: 13thFeb, 2023 | Accepted: 10th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

جذبات کے اظہار میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ غزل کے موضوعات عمومی طور پر عشقیہ ہوتے ہیں اور اس میں ایک خاص طرح کی رومانوی فضا بنتی ہے۔ اس کے برعکس نظم کا ایک موضوع سماج بھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نظم نے انتہائی تیزی کے ساتھ اردو ادب میں اپنی جڑوں کو مضبوط کیا ہے۔ اور اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوا ہے۔ گو غزل میں اشعار کی انفرادی حیثیت ایک طرح کی آزادی ہے لیکن کلی طور پر غزل کے قالب میں وہ سہولت اور آسانی نہیں جو نظم کی ہیئت میں شاعر کو حاصل ہوتی ہے۔ غزل کے خاص موضوعات ہجر و وصال، گل و بلبل، عاشق و معشوق، غمِ جاناں اور غمِ دوراں وغیرہ ہیں لیکن یہ کلی حالات نہیں جبکہ نظم کے موضوعات انتہائی وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نظم سماجی اور معاشرتی زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحقیقی اور تنقیدی نگارشات کا بغور مطالعہ کریں تو اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ فطری طور پر تخلیقی ذہن رکھتے ہیں اور شاعری اُنکی شخصیت میں داخل ہے۔ ان کے جملوں میں شعری اور رومانی رنگ اُن کی تنقید کو شاعری کے قریب تر کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اور انہوں نے سکول کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ بقول ڈاکٹر طاہر تونسوی:

> "جہاں تک میری ادبی زندگی کے آغاز کا تعلق ہے تو میں نے سکول کے زمانے ہی سے لکھنے پڑھنے کی جانب توجہ کی۔ پہلے شاعری کی اور استاد فیض تونسوی سے اصلاح لی بعد میں کالج میں اساتذہ کی بنا پر یہ شوق پروان چڑھا۔ مطالعہ نے لکھنے کی طرف راغب کیا اور یہ سفر اب تک جاری ہے۔ جہاں تک کسی سے متاثر ہونے کا تعلق ہے تو میں نے کئی بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ رفیق خاور جسکانی، عرش صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے دانشوروں نے میری ادبی تربیت کی ہے اور مجھے اس ہنر سے آشنا کیا ہے۔ باقی میرا شوق اور میری محنت مجھے منزل کا راستہ دکھاتے رہے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے ذہنی میلان اور اپنے محبوب استاد ڈاکٹر سلیم اختر کی ترغیب کے سبب شاعری کی نسبت نثر پر توجہ زیادہ کی۔ اس طرح انکی نثر کو شاعری پر فوقیت تو حاصل ہو گئی لیکن انہوں نے شاعری کو مکمل طور پر خیر باد نہیں کہا۔ یہ ایک اچھے استاد کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگرد میں چھپا ہوا جوہر تلاش کرے اور پھر اسکی تمام تر توجہ اس نقطے کی طرف مرکوز کر دے جو آگے چل کر اسکی شناخت بن جائے چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اپنے شاگرد میں پوشیدہ صلاحیتوں کا ادراک کرتے ہوئے انہیں نثر کی طرف راغب کیا۔ اس بات کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے:

"آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں میں نے زمانہ طالب علمی میں طاہر کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے شاعری نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تاکہ ہمہ تن تنقید اور تحقیق کے لئے خود کو وقف کر سکے۔ مجھ سے تو کہتا رہا کہ شاعری ترک کر دی ہے مگر چپکے چپکے اور خفیہ طور پر یہ "فعلِ بد" جاری رکھا۔ مجھے تب علم ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا لہذا میں بھی داد دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ اب اسکا کلام مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہوتا ہے اور مشاعروں میں نہ صرف کلام سناتا ہے بلکہ اسٹیج سیکرٹری کا فریضہ بھی بطریقِ احسن ادا کرتا ہے۔"(۲)

"ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شعری تخلیقات ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ادبی جرائد و رسائل میں چھپنا شروع ہوئیں تاہم ستر کی دہائی میں وہ اپنے شعری نقوش اوراقِ ادب پر ثبت کر چکے تھے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا شعری مجموعہ "تو طے ہوا نا" ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔"(۳)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کا یہ مجموعہ بزمِ علم و فن پاکستان نے شائع کیا۔ اس کا دیدہ زیب سرورق معروف آرٹسٹ زوار حسین نے بنایا۔ اگرچہ یہ مجموعہ تخلیقات کے حوالے سے مختصر ہے لیکن اس کے مشمولات اہمیت کے حامل ہیں۔ توقیت نامہ سے آغاز ہوتا ہے انتساب اور فہرست کے بعد "عرضِ ہنر" کے عنوان سے طاہر تونسوی کی تحریر ہے اس کے بعد "اعتبارِ نغمہ" کے نام سے ڈاکٹر اسلم انصاری کا دیباچہ ہے۔ بعد ازاں "طے شدہ حقیقت" کے عنوان سے شاہد واسطی نے اظہارِ خیال کیا ہے اور طاہر تونسوی کے شخصی، فنی اور فکری گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ محسن نقوی کے بقول:

"ڈاکٹر طاہر تونسوی کم کہتے لیکن اچھا کہتے ہیں۔"(۴)

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کے مجموعہ کلام میں حمد، نعت، سلام کے علاوہ انکی منفرد نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس دور میں ہونے والی شاعری کے زیرِ اثر ڈاکٹر طاہر تونسوی نے روایتی مضامین کو بھی اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ اس دور میں علامہ اقبال کی شاعری نوجوانوں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ اس کے علاوہ فیض احمد فیض، ساحرؔ لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی انقلاباتِ زمانہ کو شاعری کا موضوع بنا رہے تھے۔ علاوہ ازیں احمد فراز جیسے اہم شعراء ادبی افق پر چھائے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال میں اپنے لیے الگ راہوں اور رنگوں کا انتخاب کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ مگر یہ کام ڈاکٹر طاہر تونسوی اور انکے ہم عصروں نے احسن طریقے سے انجام دیا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ درج ذیل ہے:

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ۲۰۰۰ء میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کرنے کا شرف حاصل کیا۔ اس سفر کے دوران انہوں نے جو حمدیہ اور نعتیہ اشعار تخلیق کیے ہیں ان میں حضورؐ سے بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ ان

اشعار میں ایک عاشق صادق کی اپنے محبوب کے وصل کیلئے شدید تڑپ نظر آتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے عشقِ رسولؐ میں شاعر پر سرمستی، بے خودی اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوگئی ہو اور ظاہری دنیا سے اسکا رابطہ منقطع ہو گیا ہو اور وہ ایک روحانی کیف و سرور کے عالم میں پہنچ گیا ہو ڈاکٹر طاہر تونسوی کے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں عشق و محبت کی تمام کیفیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ حمد کے عنوان سے لکھی گئی نظم اگرچہ ایک دعائیہ نظم ہے لیکن اس پوری نظم میں ایک عاشق صادق کی محبوب کے پاس جانے سے پہلے کی تیاری اور کیفیت کو دیکھا جاسکتا ہے اور حُبِ رسولؐ کا یہ عالم ہے کہ عنوان حمد کا ہے اور تمام اشعار محبت رسولؐ میں گندھے ہوئے ہیں:

کچھ نہیں مانگتا ہوں تجھ سے مرے ربِ جلیل
میری جھولی میں فقط خاکِ مدینہ دے دے
کس طرح بات کروں شاہِ مدینہ سے شہا
حالِ دل مجھ کو سنانے کا قرینہ دے دے
(حمد)(۵)

ایک سچے عاشق کو محبوب کے تصور کے بغیر ایک پل چین نصیب نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اپنے دل اور ذہن کو اپنے محبوب کے ساتھ وابستہ کیے رکھتا ہے۔ خیالِ یار ایسا مرکز و محور بن جاتا ہے جو اس کی کل کائنات ہوتی ہے۔ اسی لئے شاعر کو مکہ میں رہ کر بھی مدینے کا خیال آتا ہے:

یاد جب مجھ کو ترا نورِ جمال آتا ہے
رہ کے مکے میں مدینے کا خیال آتا ہے
(حمد)(۶)

ہر عاشق کیلئے لمحاتِ وصل حاصلِ متاع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب یہ متاع اور منزل قریب آجائے تو عاشق کا ایک ایک پل مشکل سے گزرتا ہے اور عاشق کا دل اضطرابی کیفیت میں آجاتا ہے اور محبوب کی قربت اور دیدار کی طرف بڑھتا ہوا ہر قدم عاشق کے دل میں جذبات کا طلاطم اور ذہن میں خیالات کا خزینہ موجزن کر دیتا ہے۔ اس کیفیت کو ذاتی تجربہ کے روپ میں شاعر نے مکہ سے مدینہ جانے سے پہلے اس طرح تخلیق کیا ہے:

مکے میں ہوں در پیش مدینے کا سفر ہے
حالِ دلِ بیتاب کی آقا کو خبر ہے
چوموں گا وہاں جا کے میں سرکار کی چوکھٹ
یہ میری متاع اور یہی میرا ثمر ہے
(حمد)(۷)

دوئی کا تصور عاشق کے لئے موت کے پروانے سے کم نہیں ہوتا۔ عاشق کی ایک بہت بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اور اسکا محبوب ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ خیال غیر عاشق کے پاس سے پھٹکے نہ محبوب کے۔ وہ تنہائی میں راز و نیاز کی باتیں کریں۔ محبوب عاشق کو اپنے قدموں میں خود بٹھائے اور جب ایک مرتبہ عاشق محبوب کے قدموں میں بیٹھ جائے تو عاشق کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ یہ جاں فزا لمحہ ابدیت کا روپ دھار لے اور اسکی یہ کیفیت دائمی ہو جائے اور کوئے یار میں اُس کی تمام عمر بیت جائے اور دیارِ محبوب اس کا مستقل ٹھکانا ہو اور پھر رُخِ محبوب سے پردہ اُٹھ جائے اور وہ رخِ انور کے دیدار کی روح پرور منزل حاصل کر لے۔ مکہ سے مدینہ پہنچ کر شاعر نے عشقِ رسولؐ میں اسی قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

آ بیٹھا ہوں قدموں میں اے شاہِ دو عالم
اس حال میں رہنے کی دعا دیجیے مولا
بھاتی ہیں مرے دل کو مدینے کی فضائیں
خواہش ہے یہیں مجھ کو بسا دیجیے مولا
تسکین نہیں ہوتی کہ نہ جب تک تمہیں دیکھوں
دیدار رخِ پاک کرا دیجیے مولا
(حمد)(۸)

کیفیاتِ عشق و محبت میں فراق و جدائی کے لمحات عاشق کیلئے عذاب سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس کیفیت میں ایک سچا عاشق ماہی بے آب کی کیفیت میں آجاتا ہے۔ غم و یاس کی یہ کیفیت اس کیلئے آہ و فغاں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اُس کے قلب و روح پر مایوسی اور ملال کے سائے منڈلانے لگتے ہیں اور بات آہوں اور سسکیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بے قرار اور داغدار دل کو کہیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ اور فراق و جدائی کے لمحات میں ایک عاشق کا واحد سہارا "یاد" ہی ہوتی ہے جو اس کیلئے سرمایۂ حیات کا کام دیتی ہے اور اس کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام دیتی ہے۔ محبوب سے جدا ہونے کے منظر میں شاعر نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مدینہ سے واپس روانہ ہونے کی کیفیت میں محبت اور جدائی کی کسک کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

یثرب سے الوداع کا منظر نہ پوچھیے
کیفیتِ فراقِ پیمبرؐ نہ پوچھیے

رکتے نہیں ہیں آنکھ سے آنسو کسی طرح
در سے ہوا ہوں آج میں بے در نہ پوچھیے
(حمد)[۹]

ڈاکٹر محمد عاشق خان کے بقول:

"ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شاعری کا ایک مضبوط حصہ مذہبی جذبات پر مشتمل اشعار اور منظومات ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام "تو۔۔۔۔ طے ہوا نا" میں حمد اور نعت کے کئی اعلیٰ نمونے فراہم کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے سلسلے میں جذب و محبت سے سرشار ہیں۔ انہوں نے حمدیہ اشعار کی پیش کش میں اپنے مخصوص لہجے کا اظہار بھی کیا ہے۔ حمد کے اشعار میں نعت کے جذبے کی شمولیت ایک ایسا تجربہ ہے جسے نادر کہا جا سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جب فنکار حمد کے اشعار کہہ رہا ہو تو صرف حبِ الٰہی کا جذبہ پیش ہوتا ہے۔ لیکن طاہر تونسوی کا کمال یہ ہے کہ عشقِ الٰہی میں عشقِ رسولؐ کو بھی سمو دیتے ہیں۔ اور اس طرح خدا اور اسکے رسولؐ کی ذات کے ناگزیر رابطے کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔"[۱۰]

"نبوت کا اسمِ اول" بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی کی عظیم نعتیہ نظم ہے۔ یہ نظم آزاد ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ آزاد ہئیت میں ہونے کے باوجود اس نظم میں جوش، ترنم اور نغمگی موجود ہے۔ اس نظم میں کمال مہارت سے حضورؐ کی شان اور فضیلت بیان کر کے آپؐ کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ حضورؐ سے عشق و محبت کا اظہار بھی اس نظم کا دوسرا اہم مضمون ہے۔ تیسرا اہم مضمون اس نظم میں حضورؐ کی رضا اور شفاعت کا حصول ہے۔ تئیس مصرعوں کی اس مختصر نظم میں طاہر تونسوی نے اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ اور تہذیب کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے انسانی تہذیب تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی۔ انسان بنیادی حقوق اور آزادیوں سے محروم تھا۔ جنگل کا قانون تھا۔ نہ کسی کا مال محفوظ تھا، نہ جان نہ عزت اور نہ گھر۔ بھائی بھائی کا دشمن، قبیلہ قبیلے کا دشمن، نہ انصاف، نہ مساوات، نہ بھائی چارہ، نہ رواداری، نہ معاشرت کا کوئی اصول نہ معیشت کا اور نہ سیاست کا نہ مذہب کا، خود پیدا کی ہوئی بیٹیاں زندہ درگور کر کے فخر کے شادیانے بجائے جاتے۔ انسانیت کی اس سے بڑھ کر تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ سورج، چاند، ستاروں اور اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز۔ اسی تہذیبی پستی کی طرف شاعر نے یوں اشارہ کیا ہے:

مگر اس کی بعثت سے پہلے

اس انسانیت کا شجر مضمحل تھا(۱۱)

ایسے میں اللہ تعالیٰ کے اس محبوب نبی ﷺ کی بعثت ہوئی جو وجہِ تخلیقِ کائنات تھا۔ جو عرشِ بریں پر ماہِ تاباں تھا۔ تعریف کیا گیا تھا، رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھا، قرآن مقدس کی تفسیر کل تھا۔ نبوت کا اسمِ اول تھا۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے آپ ﷺ کے انقلاب آفریں پیغام سے وہی تہذیب عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ یہ مضمون ڈاکٹر طاہر تونسوی نے قرآن پاک سے اخذ کیا ہے۔ قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یا ایھا النبی انا ارسلنك شاھدا ومبشرا ونذیرا۔ وداعیا
الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا۔(۱۲)

ترجمہ: "اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے

شاعر کا اندازِ عقیدت ایمان افروز ہے:

وہ عرشِ بریں پر چمکتا ہوا ماہِ تاباں
محمد تھا احمد تھا وہ الہدیٰ تھا
مگر اس کی بعثت سے پہلے
اس انسانیت کا شجر مضمحل تھا
فلک سے جب اترا زمیں پر
کتابِ مبیں کی سراپا وہ تفسیرِ کل تھا
نبوت کا وہ اسمِ اول
فقط اپنی امت کی بخشش کی خاطر
سراپا دعا تھا(۱۳)

اس طرح مومن کے ایمان کی پہلی شرط ہی محبتِ رسول ﷺ ہے۔ اس لئے شاعر آپ ﷺ کی رضا، سفارش اور شفاعت کا عاجزی کے ساتھ طلب گار ہے۔ شاعر آپ ﷺ کو اپنا رہبر و رہنما، آقا و مولا قرار دیتا ہے اور دونوں جہانوں میں کامیابی اور سرخروئی کے لئے فقط آپ ﷺ کی نظرِ کرم کو کافی سمجھتا ہے۔ ہر مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر متاعِ عظیم نہیں ہو سکتی کیونکہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں(۱۴)

نظم کے آخری بند میں شاعر نے حضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ وہاں جاکر سبز گنبد کو دیکھے اور اس درِ پاک کو بوسہ دے جس در پر آنے کے لئے فرشتے بھی دعا کرتے ہیں:

مگر میں تو عاجز گنہگار بندہ
ندامت سے سر کو جھکائے
اسی کی شفاعت اسی کی رضا چاہتا ہوں
کہ وہ میرا مولا
وہی میرا آقا
کرم کی نظر مجھ پہ کر دے
تو کچھ بھی نہیں چاہیے اس جہاں میں
اور پھر اس جہاں میں (۱۵)

نظم "ولایت کا اسمِ اول" میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے حضرت علی سے اپنی قلبی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی عظمت و فضیلت بیان کی ہے۔ اس نظم سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصوف سے دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے اس نظم میں ہمارا رشتہ تاریخ اسلام سے جوڑا ہے۔ سلسلۂ ولایت کا آغاز حضرت علی سے ہوا۔ شاعر نے حضرت علی کی خانہ کعبہ میں ولادت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ نظم کی پیش کش ڈرامائی ہے اور فضا سسپنس اور استفہامیہ لب و لہجہ سے معمور ہے۔ ولادتِ حضرت علیؑ کے وقت دیوارِ کعبہ میں شگاف ہونا اور ایک ایسے نور کا ظہور ہونا جو اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اس پر زمین و آسمان اور کل کائنات کو حیرت میں غلطاں دکھا کر زمین و آسمان کو ہم کلام کرا کے خوبصورت فضا پیدا کی گئی۔

حضرت علی کو "نورِ رب"، "نبی آخر کی نسلِ اطہر کا پاسباں"، "ولایت کا اسمِ اول" اور خلعتِ علی کے نور کی تقدیم کو بیان کر کے آپ کی شان و عظمت کے سربستہ راز کو آشکار کرنے کا شرف حاصل کیا گیا ہے۔ کیا خوبصورت پیش کش ہے:

زمیں الگ شک میں مبتلا تھی
فلک بھی چپ چاپ دیکھتا تھا
سکوتِ ارض و سما کو آخر
صدائے عرشِ بریں نے توڑا
سنو! سنو! یہ بھی ساکنانِ زمین سن لو

یہ نور رب ہے
نبی آخر کے واسطے سے بشر کے پیکر میں ڈھل گیا ہے
تمہاری نظروں سے جو نہاں تھا
وہ آج ہم سب کے درمیاں ہے
نبی آخر کی نسلِ اطہر کا پاسباں ہے
کہا فلک نے زمین سے ہم زبان ہو کر
ہمیں خبر ہے
کہ وہ نبوت کا اسمِ اول
تو یہ ولایت کا اسمِ اول
فقط علی ہے
سوا علی کے کوئی نہیں ہے
علی!
ولایت کا اسمِ اوّل (۱۶)

ڈاکٹر سید قاسم جلال کے بقول:

"ولایت کا اسم اوّل" کے عنوان سے حضرت علی کی شان میں لکھی ہوئی ڈاکٹر تونسوی کی منقبت اپنے اندر عقیدت و رمزیت کا سمندر لیے ہوئے ہے۔"(۱۷)

تاریخِ اسلام میں محرم کا مہینہ ایک عظیم روایت اور استعارہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ کیونکہ یہ مہینہ سبطِ پیغمبر ﷺ حسینؑ ابن علیؑ کے جذبۂ شوقِ شہادت کی گواہی دیتا ہے جس کے تحت امام عالی مقام نے دینِ حق کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دیا۔ اپنے بچوں، بھتیجوں، بھائی اور جانثاروں کو قربان کر دیا اور خود نوکِ نیزہ پر تلاوت کا شرفِ عظیم حاصل کیا۔ ظلم و جبر کی باطل قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس طرح عزم و ہمت اور جرأت و بہادری کی ایک ایسی مثال قائم کی جو سرفروشانِ مذہب و ملت کے لئے ایک عظیم تحرک کا سرچشمہ اور مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس طرح محرم کا مہینہ ایک طرف اہلِ اسلام کے لئے خانوادۂ رسول ﷺ کی جرأت و بہادری کی یاد دلاتا ہے تو دوسری طرف اس سانحہ عظیم میں شہید ہونے والوں کے غم میں رلاتا ہے اور نہ صرف خاندانِ نبوتؐ سے محبت و ہمدردی پیدا کرتا ہے بلکہ ہر دور کے ظالم کی مخالفت اور مظلوم سے محبت و ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ طاہر تونسوی کی نظم "اسے کہنا محرم آ گیا ہے" اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے یہ نظم بھی ہمارا رشتہ تاریخ و

تہذیب سے جوڑتی ہے۔ دھیمے لہجے میں لکھی گئی اس نظم میں شاعر نے امام حسینؑ اور خاندانِ نبوتؐ کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

اسے کہنا محرم آ گیا ہے
محرم جو روایت ہے نبی کے خانوادے کی شجاعت کی
محرم جو شہادت ہے حسین ابنِ علی کے جذبۂ شوقِ شہادت کی
محرم جو گواہی ہے خدا کی راہ میں گھر کو لُٹانے کی
محرم جو گواہی ہے نبی کے دینِ برحق کو بچانے کی
محرم جو گواہی ہے سرِ نیزہ تلاوت کی
محرم جو منادی ہے خطابت کی نجابت کی (۱۸)

سانحہ کربلا تاریخِ عالم کا ایک ایسا غمناک واقعہ ہے جسے پڑھ کر ایک طرف انسان کا دل دہل جاتا ہے اور اس کا اپنے اوپر ضبط رکھنا محال ہو جاتا ہے تو دوسری طرف انسان میں صبر و استقامت اور جرأت و بہادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے تحت انسان بلند نصب العین کی خاطر اپنا گھر، مال، دولت، عزیز و اقارب، جان بلکہ ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح واقعہ کربلا ایک ایسا سرچشمۂ شعور و آگہی ہے جس کی تاثیر قیامت تک کم نہیں ہو سکتی ۔نواسۂ رسول ﷺ اور ان کے جانثار ساتھی تین دن کے پیاسے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے میدان کربلا میں تشنہ لبی کا ایسا منظر تھا جس کی وجہ سے گھاٹیوں میں اشکوں کا سیلِ رواں جاری تھا۔ دینِ خدا کی حفاظت و بقا کے لیے نواسۂ رسول ﷺ کے کمسن فرزند علی اصغر جامِ شہادت نوش کر گئے۔ آپ کے جواں سال فرزند علی اکبر کے سینے میں برچھی لگ چکی تھی پھر بھی حسینؑ کے حوصلوں میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ یزیدی افواج پر ایک خوف چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم "سلام" اسی طرح کا ماحول لیے ہوئے ہے جس میں انہوں نے سانحہ کربلا اور شامِ غریباں کا منظر نظم کر کے خاندانِ نبوت ﷺ کو ہدیۂ سلام و خراجِ عقیدت پیش کیا ہے واقعہ کربلا میں امامِ عالی مقام اور ان کے جانثاروں کی شہادت کے بعد جو شامِ غم خاندانِ نبوتؐ کی مستورات پر آئی اور حضرت سجاد اور حضرت زینب کو مستورات کے ساتھ جب دربارِ یزید میں شام کی گلیوں میں سے گزار کر لے جایا گیا تو یہ خاندان نبوت کے لئے قیامت کی گھڑی تھی۔ مصیبت کی اس المناک گھڑی میں بھی بیبیوں کا حوصلہ اور ضبط تاریخِ انسانیت میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ شامِ غم کا منظر شاعر نے یوں نظم کیا ہے:

ارض و سما کے پاس کہاں ایسی جرأتیں
وہ صبر بے مثال کہ خیمہ زنوں میں تھا

خیمے بھی جل گئے تھے ردائیں بھی چھن گئیں
اب بیبیوں پہ وقت کڑا راستوں میں تھا
سجاد سوگوار کے ہاتھوں میں تھی مہار
کچھ بیڑیوں کا شور انہی دائروں میں تھا
اس سانحہ پہ رو پڑے طاہر یہ آسماں
عالم جو ضبط گریہ کا ان بیبیوں میں تھا[19]

اپنی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی نے تاریخی شعور دینے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی تہذیب کے فروغ کا کام کیا ہے "یزیدانِ وقت پر خوف کا چھایا ہونا" ایک منفرد مضمون ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے نعتیہ کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک طرف تو حضور ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت کے جذبات ملتے ہیں تو دوسری طرف اس میں اسلامی تہذیب و تاریخ کا شعور موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم "نعت" فصاحت و بلاغت کی ایک بڑی مثال ہے جس میں عرب تہذیب پر اسلام کے مثبت اثرات کو ایمائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب تہذیب ظلمت اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک ایسا پر خطر اور پر خار دور تھا جس میں انسانیت رسوا تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظام تھا۔[20] قبائلی عصبیت و نفرت کی بنا پر معاشرہ فسادات میں الجھا ہوا تھا۔ نہ مذہب، نہ معاشرت، نہ تہذیب و شائستگی۔ ہر طرف وحشت و بربریت۔ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور۔ نہ اعلیٰ فکر، نہ ارفع سوچ، نہ تہذیبی شعور، نہ عدل، نہ اخوت، نہ رواداری، نہ مساوات، کمزور کا کچھ محفوظ نہیں ایسے پس منظر میں جب پیش منظر پر نورِ محمد ﷺ جلوہ فگن ہوا تو "مہر و محبت کے کنول کھلنے لگے" ایک دوسرے کی جان کے دشمن بھائی بھائی بن گئے۔ بھائی بھی ایسے کہ اپنا سب کچھ دوسرے بھائی پر نثار کرنے کو تیار ہو گئے۔ پھر انسان نے "زندہ رہنے کا قرینہ سیکھا" تہذیب سیکھی، معاشرت سیکھی، معیشت سیکھی، سیاست سیکھی، جہاد سیکھا، وقار سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا۔ مادی طاقت پر "الفاظ اور طرزِ تکلم" نے غلبہ حاصل کر لیا۔ لوگوں نے دلیل سیکھی، فکر سیکھا، احساس سیکھا، شعور سیکھا، مذاکرات سیکھے، دین کا کام اس محبت سے شروع ہوا کہ چار دانگ عالم میں "حق و صداقت" (اسلامی تعلیمات) کی آواز سنائی دینے لگی اور لوگ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ "تو فکر و احساس کی دنیا پر تبسم آ گیا"۔ شاعر کا انداز پر اثر اور خوبصورت ہے:

ظلمتِ شب پہ ہوا نور کا جب رد عمل
خاکِ یثرب پہ کھلے مہر و محبت کے کنول

آپ آئے تو اس انسان نے جینا سیکھا
دورِ پُر خار میں رہنے کا قرینا سیکھا
لفظ زندہ ہوئے اور طرزِ تکلم آیا
فکر و احساس کی دنیا پہ تبسم آیا
ریگِ صحرا سے چلی رشد و ہدایت کی ہوا
چار سو گونج گئی حق و صداقت کی نوا (۲۱)

پھر حق کے سامنے باطل نے مزاحمت کی۔ اہلِ حق کے خلاف وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے گئے جو پسپا ہوتی ہوئی باطل قوتوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ اہلِ حق پر ظلم و جبر، مقاطعہ، ہجرت، غزوات اور پھر بالآخر جب "دستِ تنویر" نے "اندھیرے کی لکیر کو کاٹ دیا" یعنی حق و باطل کے سب سے بڑے معرکۂ فتح مکہ میں حق کو نصرت ہوئی اور باطل کو رسوا ہونا پڑا تو آپ ﷺ کو عرب میں سیاسی قوت اور غلبہ حاصل ہو گیا۔ اور اس کے زیرِ اثر اہلِ عرب کی سوچ میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ ان کے زنگ آلودہ دل و دماغ نکھرنے لگے۔ بقول شاعر:

؎ جاگ اٹھا صدیوں کا سویا ہوا انساں کا ضمیر (۲۲)

اور اسلام کی فکر اور نظمِ محمد ﷺ نے وہ رفعت بخشی کہ اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا اور دنیا کی ایک غالب قوت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے نتیجے میں آپ ﷺ کو خدا تعالیٰ نے وہ رفعت و عظمت عطا کی کہ اس دنیا میں بھی آپ ﷺ کو معراج انسانیت پر پہنچایا اور معراج کی شب بھی اپنے پاس بلایا اور آپ ﷺ کو سارے جہاں اور کون و مکاں کا مولا بنایا۔ شاعر نے اس پورے منظر کو یوں نظم کیا ہے:

دستِ تنویر نے جب کاٹی اندھیرے کی لکیر
جاگ اٹھا صدیوں کا سویا ہوا انساں کا ضمیر
قاصدِ رب کی رسائی بھی نہیں ہے کہ جہاں
شبِ معراج بلایا گیا انساں کو وہاں (۲۳)

اس نظم میں شاعر نے فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھاتے ہوئے کئی نادر تراکیب استعمال کی ہیں۔ "ظلمتِ شب" اور "دورِ پُر خار" سے اسلام سے پہلے عربوں کے حالاتِ زندگی کی طرف اشارہ ہے جو الفاظ کا بر محل استعمال ہے۔ اسی طرح "ریگِ صحرا" "دستِ تنویر" "قاصدِ رب" خوبصورت تراکیب ہیں جو اپنے اندر معانی کا سمندر لئے ہوئے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری اور ان کا علمی مقام و مرتبہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ انہوں نے اپنے روح پرور کلام سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عالم اسلام کی بالعموم جو گراں قدر خدمت کی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو خودی، خودداری، عزم و ہمت، محبت و اخوت اور آزادئ فکر و عمل کا درس دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اقبال کے عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے پیغام پر عمل پیرا ہو کر غلامی کی زنجیریں توڑیں اور ایک آزاد وطن حاصل کیا۔ علامہ اقبال کے علم و دانش اور فلسفیانہ تصورات نہ صرف مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں بلکہ انہوں نے "چاندنی کے کنول اگا کر تیرگی کے جس طلسم کو توڑا ہے" اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوئی ہے۔ اس طرح اقبال نے امتِ مسلمہ ہی نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی مسیحائی کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی آزاد بحر میں لکھی گئی نظم "روحِ آدم کا مسیحا" اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ جس میں ایک طرف انہوں نے اقبال کی علم و حکمت اور فلسفیانہ خیالات کا اعتراف کیا ہے تو دوسری طرف ان کے کلام کی اثر انگیزی کو ان کی معروف کتابوں کے حوالے سے منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ نظم میں اقبال کے لئے جوش اور عقیدت کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

مجھے خبر ہے
یہ میرے وجدان نے کہا ہے
وہ علم کا بے کراں سمندر
وہ عقل و دانش کا اک شجر ہے
وہ جس کی شاخوں نے فہم و ادراک کو بھی جو
چاندنی کے کنول اگائے ہیں تیرگی میں
طلسم توڑا ہے ظلمتوں کا
نئی سحر کا شعور ابھرا۔۔۔ کہ اس نے
ہر لفظ کے معانی بدل دیے ہیں ش جمال بخشا(۲۴)

نظم کے آخری تین مصرعوں میں اقبال اور غالب کی مماثلت کو خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ہے:

مجھے خبر ہے
کہ روحِ غالب بھٹک رہی تھی خلا کی بے پایاں وسعتوں میں
زمیں پہ اتری تو اس نے اقبال نام پایا (۲۵)

وطن سے محبت کو جزوِ ایمان کہا جاتا ہے۔ انسان جس سر زمین پر آنکھ کھولتا ہے۔ جس سر زمین پر پلتا بڑھتا ہے جس ماحول میں اس کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا گزرتا ہے۔ جس سر زمین کی ہواؤں میں وہ سانس لیتا ہے۔ جس کی مٹی میں اس کے اجداد کے اجسام دفن ہوتے ہیں۔ اس سر زمین سے والہانہ انس و محبت ایک فطری عمل ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اپنے وطن پاکستان سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم "اے وطن اے مری جان شیریں وطن" میں ان کی اپنے وطن پاکستان سے محبت کا اظہار واضح ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے وطن کے شہروں، قصبوں، سرو سمن، کوہ و دمن، پگڈنڈیوں، شاہراہوں، جھوکوں، بیلوں، بھنگڑوں، میلوں، ٹھیلوں، ہواؤں اور فضاؤں بلکہ ہر چیز سے پیار و محبت ہے۔ اسی لئے اس پوری نظم میں وطن کے لئے دعا کی گئی ہے:

تیرے شہروں پہ رحمت ہو سایہ فگن
تیرے قصبوں پہ چھائی رہے اک پھبن
پھولے پھلتے رہیں تیرے سرو سمن
ہنستا بستا رہے تیرا ہر اک چمن
اے وطن اے مری جان شیریں وطن(۲۶)

اس نظم میں پنجاب کی ثقافت و معاشرت کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور اپنے ہم وطنوں سے محبت کا اظہار بھی کیا گیا ہے نظم کے اندر سادگی، ترنم اور نغمگی کی خصوصیات موجود ہیں۔ اس نظم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سرائیکی الفاظ شامل کر کے خوبصورتی پیدا کی گئی ہے۔ نظم میں سرائیکی کا ایک لفظ "شالا" چار مرتبہ آیا ہے۔ یہ دعائیہ کلمہ ہے جس کا مطلب ہے "اللہ کرے"۔ یہ لفظ اس بے ساختگی سے آیا ہے کہ یہ اردو زبان کا لفظ محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ "جھوکوں" بھی سرائیکی سے شامل کیا گیا ہے۔ ان الفاظ سے طاہر تونسوی کے اسلوب کی انفرادیت اس نظم سے جھلکتی ہے۔ ڈاکٹر عاشق خان لکھتے ہیں:

> "منظر کشی اور ماحول پیشی میں طاہر تونسوی کی روانی اور لفظوں کی فراوانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظم کے موضوع سے شاعر کو قلبی و ذہنی لگاؤ ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے جذبات کی پیش کش میں، لفظوں کے تصرف کے سلسلے میں پوری دسترس حاصل ہے۔"(۲۷)

آزاد ہئیت میں تخلیق کی گئی ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم "ندیم صاحب کے لئے ایک نظم" معروف شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار احمد ندیم قاسمی کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے احمد ندیم قاسمی سے اپنے والہانہ محبت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اور دوسری طرف احمد ندیم قاسمی کی ادبی حیثیت و مقام و مرتبہ کی ثنا خوانی بھی کی ہے۔ انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو عظیم شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس اور عظیم انسان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اور اپنے اوپر ان کے احسانات کا تذکرہ بھی کیا ہے:

سکوتِ شہر میں تیری صدا ہی گونجتی ہے
ترے کلام نے موسم نئے دکھائے ہیں
تری غزل کہ مری روح کی طراوت ہے
تری ہی نظم سے میں دل میں تازگی پاؤں
تری کہانی مرے عہد کی کہانی ہے
مرے جہاں کا سب عکس تیرے کالم ہیں
سخنوری کا جو فن ہے تری عطا ہے مجھے
مجھے یہ فخر کہ میں تیرے عہد میں
زندہ وہ یوں کہ تجھ سے بھرم میرا قائم و دائم (۲۸)

اس نظم میں امید کا دامن نہ چھوڑنے اور مصائب و آلام اور مشکلات کے سامنے ڈٹ جانے کا عظیم پیغام بھی موجود ہے جو ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے ممدوح کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

حسن و عشق کی کیفیات میں محبوب کا وصل و قرب عاشق کیلئے زندگی کے اہم ترین اور نایاب لمحات میں سے ہوتا ہے محبوب کے ساتھ گذرا ہوا ہر پل عاشق کے لئے سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ وصلِ یار میں محبوب کے بدن کا لمس عاشق کو لطف و سرور کی اُن منزلوں پر لے جاتا ہے جہاں پر عاشق کے دل و جان اور قلب و ذہن پر رومانوی کیفیات کے ایسے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں جن کی اہمیت اور تاثیر ابدیت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور یہ پر کیف لمحات ہمیشہ عاشق کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور اگر عاشق اور محبوب وصل کی کیفیات سے محروم ہو جائیں تو گذرے ہوئے لمحاتِ وصل اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور عاشق کی یادوں کا سرمایہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم "ایک نظم اس کے لئے" اسی طرح کی رومانوی فضا کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کمال فنکارانہ مہارت سے حسنِ محبوب کی جو سراپا نگاری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر کو محبوب کی چال ہرنیوں جیسی لگتی ہے۔ محبوب کی آواز

اس کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اس کے پاؤں اطلس و کمخواب کی طرح گداز محسوس ہوتے ہیں۔ اور محبوب کے عشوے، غمزے، ادائیں اور باتیں شاعر کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، بحوالہ اعزاز احمد آذر، ڈاکٹر طاہر تونسوی سے گفتگو، شمارہ ۱۵، ۱۹۹۴ء، مطبوعہ اہل قلم، مکتبہ اہل قلم ملتان، ص ۱۷۴

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، بحوالہ صدف سلطانہ، ادبیاتِ اردو کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کردار، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو، جامعہ سندھ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۲

۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، (انٹرویو) از مقالہ نگار، ملتان، ۲۰ اگست ۲۰۱۷ء، بوقت ۱۰ بجے دن)

۴۔ ایضاً

۵۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو طے ہوا نا، پاکستان، بزم علم و فن، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۶۔ ایضاً ، ص ۳۵

۷۔ ایضاً، ص ۳۶

۸۔ ایضاً، ص ۳۷، ۳۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۰۔ محمد عاشق خان، ڈاکٹر، اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات، ص ۵۷، ۵۸

۱۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر تو۔۔۔۔ طے ہوا نا، ص ۴۲

۱۲۔ قرانِ مجید، سورۃ الاحزاب، پارہ ۲۲، آیت ۴۵، ۴۶

۱۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔ طے ہوا نا، ص ۴۶

۱۴۔ اقبال، علامہ محمد، بانگ درا، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸۳

۱۵۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔ طے ہوا نا، ص ۴۲، ۴۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۸، ۴۹

۱۷۔ قاسم جلال، سید، ڈاکٹر، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شاعری، مشمولہ، طاہر شناسی کا نگار خانہ، مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ ندیم، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۱۴، ص ۱۳۱

۱۸۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔ طے ہوا نا، ص ۵۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۲۰۔ وارث سرہندی، مرتب جامع الامثال، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اشاعت اوّل، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۸

۲۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔طے ہوا نا، ص ۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۷۔ عاشق محمد خان، ڈاکٹر، اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات، ص ۵۴

۲۸۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔۔طے ہوا نا، ص ۵۹

References in Roman Script:

1. Tahir Taunsvi, Doctor, ba hawala aizaz ahmed azar, doctor tahir taunsvi se guftgu, shumara 15, maktaba e ehl e Qalam, multan, 1994, p,174
2. Saleem Akhter, doctor, ba hawala sadaf sultana, adbiyat e urdu ky firogh mein dr tahir taunsvi ka kirdar, tehqiqi maqala braye MA urdu jameya Sindh, 2000, p102
3. Tahir taunsvi, doctor, (Interview) az maqala nigar, multan, 20 august 2017U, bwqt 10 bajy din
4. Ibid
5. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, bazm e ilm o fun, Pakistan, 2001, p33
6. Ibid, p35
7. Ibid, p36
8. Ibid, p37, 38
9. Ibid, p41
10. Muhammad Ashiq Khan, Doctor, urdu tanqeed k firogh mein doctor tahir taunsvi ki khidmaat, p57,58
11. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p42
12. Quraan majeed, surah al ahzaab, parah22, ayat45,46
13. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p46
14. Iqbal, allama, bang e dara, national book foundation Islamabad, 1996, p283
15. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p42, 43
16. Ibid, p 48, 49
17. Qasim jalal, syed, doctor tahir taunsvi ki shayari, mishmoola tahir shanasi ka karkhana, muratba, dr samina Nadeem, ilm o Irfan publishers, lahore, 2014, p131

18. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p50
19. Ibid, p53
20. Waris sar hindi, muratab jameya al imsal, muqtadra qomi zaban, Islamabad, 1986, p148
21. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p44
22. Ibid, p45
23. Ibid,
24. Ibid, p54
25. Ibid
26. Ibid, p56
27. Muhammad Ashiq Khan, Doctor, urdu tanqeed k firogh mein doctor tahir taunsvi ki khidmaat, p 54
28. Tahir taunsvi, doctor, to tay hua naa, p59

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.334

عظمت شہزاد

پی ایچ ڈی اسکالر، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

ڈاکٹر غنچہ بیگم

اسسٹنٹ پروفیسر، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

خالد فتح محمد کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری

Azmat Shehzad
Ph.D Scholar, Sarhad University of Science and Information Technology, Peshawar
Dr. Ghuncha Begum
Assistant Professor, Sarhad University of Science and Information Technology, Peshawar

Social Realism in Khalid Fateh Muhammad's Short Stories

ABSTRACT

Khalid Fateh Muhammad is a prominent writer of current era. He has gained prominence in Urdu fiction due to his unique style, thematic diversity, and technical expertise in the creation of fiction. He has keenly observed the society. This is the reason that his stories are full of psychological and sexual diverse attitude of human beings as well as social conflicts and problems. Being a social realist, he is the spokesman of his age. He has exposed hunger, poverty, greed, unfair distribution of capital, social injustices, and hypocritical attitude of humans in his short stories. In this article, the element of social realism in Khalid Fateh Muhammad's stories is discussed.

Keywords: *Social Realism, Society, Literature, Ethics, culture,*

سماجی حقیقت نگار رومانیت کے برعکس زندگی اور سماج کے حقیقی پہلوؤں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اسی لیے حقیقت نگاری کے حوالے سے یہ تاثر بھی عام ہے کہ حقیقت نگار معاشرے کے قبیح اور گھناؤنے پہلوؤں کو موضوع بناتے ہوئے تخیل کے زور پر دلچسپ بنا کر پیش کرتا ہے۔ ہر عہد کا ادب اپنے معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادب سماج کی علاقائی، جغرافیائی اور تہذیبی و تمدنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سیاسی، مذہبی اور سماجی مسائل کو بھی بیان کرتا ہے۔

Received: 13thFeb, 2023 | Accepted: 10th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

سماج کی علاقائی، جغرافیائی اور تہذیبی و تمدنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سیاسی، مذہبی اور سماجی مسائل کو بھی بیان کرتا ہے۔ ادب ہمیشہ سے ہی عصری رجحانات و نظریات کا عکاس رہا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے بقول:

"جدید افسانوی ادب زندگی کی مصوری اور تنقید کرتا ہے جو رہبری اور رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کو محض خیالی، سطحی یا معمولی ادب سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی کی اہم ترین گتھیاں اس میں سلجھائی جاتی ہیں۔ نفسیات کے پیچیدہ معمے بھی اس میں حل ہوتے ہیں۔ امنگوں اور خواہشوں کے متصادم و متضاد طوفان یہیں اٹھتے اور ختم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان جو کچھ ہے وہ یہیں نظر آتا ہے۔"(۱)

اردو افسانے نے آغاز ہی سے داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کے برعکس عام زندگی اور معاشرے کے حقیقی کرداروں کو موضوع بنایا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں جبر و استبداد کے خلاف عالمی سطح پر آواز بلند ہوئی تو اس کے اثرات برصغیر پاک و ہند کے ادب نے بھی قبول کیے۔ یوں اس خطے میں تخلیق کیا جانے والا ادب محض جمالیاتی تسکین تک محدود نہ رہا بلکہ معاشرے کے مسائل کا علمبردار بن گیا۔ اردو افسانہ نگاری کے آغاز ہی میں دو طرح کے اسلوب نظر آتے ہیں، ایک حقیقت نگاری اور دوسرا رومانوی اسلوب۔ ڈاکٹر اعجاز راہی کے بقول:

"بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اختتام پر اردو افسانہ یک دم جوان اور توانا نظر آنے لگا۔ جب سماجی حقیقت نگاری کی ایک نئی لہر نے اردو افسانے کو گھیر لیا اور یہیں حقیقت نگاری کے باطن سے سماجی حقیقت نگاری کا نیا اسلوب پیدا ہوا۔"(۲)

یہ بات کافی حد تک درست ہے کہ ادیب سچائی کی تلاش میں بسا اوقات معاشرے کے منفی کرداروں اور رویوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے تاہم سماجی حقیقت نگار انھی بدصورتیوں میں گھری ہوئی حیات کو سنوار کر بھی پیش کرتا ہے۔(۳) اردو افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے منشی پریم چند، غلام عباس، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، منشایاد کے علاوہ ایک اہم نام خالد فتح محمد کا بھی ہے۔ خالد فتح محمد اکیسویں صدی کے ربع اول کے ممتاز ادیب ہیں۔ اب تک ان کے درج ذیل سات افسانوی مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔

۱۔ میں ۲۔ تانبے کے برتن ۳۔ جمع تقسیم ۴۔ داغ داغ اجالا
۵۔ پانچ منٹ کی زندگی ۶۔ آئینے سے باہر چہرہ ۷۔ دیواروں کے راز

خالد فتح محمد بہ طور افسانہ نگار اپنے عہد کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں فرد اور معاشرے کو موضوع بنایا ہے۔ اکیسویں صدی مادی ترقی کی صدی ہے۔ مادیت پرستی نے انسان سے خلوص و محبت اور قرابت داری چھین لی ہے۔ انسان تمام تر مادی وسائل کے باوجود داخلی سطح پر تنہائی کا شکار ہو چکا ہے۔ خالد فتح محمد اس عہد کے انسان

کے مسائل کا پوری طرح ادراک رکھتے ہیں۔ وہ اکیسویں صدی کے ماحول اور کرداروں کو پوری جزئیات کے ساتھ اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ اسد ملک کے بقول:

> "خالد فتح محمد کے ہاں فرد کے ساتھ جتنی گہری محبت، وابستگی اور ہمدردی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی معاشرے اور معاشرتی خرابیوں پر طنز کی گہرائی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے رجائیت پرستی کا نمونہ ہیں۔ وہ ایک سچے اور دیانت دار تخلیق کار کی حیثیت سے نہ صرف اپنے معاشرے کے مشکوک رویوں پر تنقید کرتے ہیں بل کہ اس کے لیے بساط بھر سفارشات اور لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہیں۔"(۴)

کسی بھی باطنی تجزیے یا داخلی حقیقت کو عیاں کرنے والی ادبی تخلیق اگرچہ نازک اور تہہ دار ہی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی سماجی صورت حال کا پرتو ہوتی ہے۔ وہ سماجی مسائل پر نہ صرف تجزیہ کرتی ہے بل کہ اس کی تنقید اور تفسیر بھی کرتی ہے۔(۵) خالد فتح محمد نے اپنے افسانوں میں مرد اور عورت کے باہمی اختلاط کو حقیقت کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ افسانہ "خانۂ سنگ" کا مرکزی کردار احمد حسن ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا بار بار ماضی کے ان ناخوشگوار واقعات کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتا ہے جب لڑکپن میں اسے والدہ ہمسایوں کی نوجوان لڑکی کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجتی ہے تاہم کچھ عرصے بعد دونوں میں جنسی اختلاط ہو جاتا ہے اور خاتون حاملہ ہو جاتی ہے۔ وہ احساس گناہ سے معمور ہو کر راہ فرار اختیار کرتا ہے:

> "دیکھو! تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ تمھیں شادی کا کہوں گی اور نہ ہی تم اس بچے کے ذمہ دار ہوگے۔ یہ میرا بچہ ہے اور میں ہی اس کی ذمے دار ہوں۔ احمد حسن کو اچانک آدمی کے سر اور عورت کے دھڑ والی عورت یاد آ گئی۔ رخشی اس بچے کی کہیں خود ہی باپ تو نہیں؟ اسے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ اس نے لباس پہنا اور رخشی سے بات کیے بغیر بھاگ گیا۔ وہ گھر نہیں گیا، وہ شہر ہی چھوڑ گیا۔"(۶)

مذکورہ افسانے میں انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کہ کہیں بھی مرد اور عورت کا آزادانہ ملاپ ان کے درمیان جنسی تعلق پر منتج ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں غریب آدمی اس طرح کے مسائل کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ معاشرے میں خیر و شر کا تصادم ازل سے موجود ہے۔ انسان احساس جرم تلے دب کر بعض اوقات راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ خالد فتح محمد کا افسانہ "تانبے کے برتن" سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار ایک عورت کا ہے جو گھر میں پڑے سالوں پرانے تانبے کے برتن ردی والے کو دے دیتی ہے۔ یہ برتن اس کی دادی ہجرت کے وقت اپنے ساتھ لائی تھی اور اس نے تاحیات ان برتنوں کو حرزِ جاں بنائے رکھا لیکن اس کی پوتی تانبے کے

برتن اونے پونے بیچ دیتی ہے۔ خالد فتح محمد نے اس افسانے میں تہذیبی بُعد اور نئی نسل کی آباواجداد سے جذباتی عدم وابستگی کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔

"باورچی خانے کے سٹور روم میں ایک شیلف پر دادی کے تانبے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ برتن دادی کے جہیز کے تھے اوران کی عمر صدی سے اوپر تھی۔ دادی نے ان برتنوں کو ہجرت کے دوران میں بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ یہ برتن آج تک استعمال نہیں ہوئے تھے۔ فضل۔۔۔۔۔ تم یہ ردی رکھ لو اور بتاؤ۔۔۔۔۔ اس دفعہ میں تھوڑا سا جھجکی۔ بتاؤ کہ تانبے کے برتن کس بھاؤ خریدو گے۔ اور جواب کا انتظار کیے بغیر میں اندر کی طرف چل پڑی"(۷)

خالد فتح محمد نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے جہاں سماج کے خارجی موضوعات کو اپنے افسانوں کا محور بنایا وہیں پر عائلی زندگی اور اس کے مسائل، خاندانی وراثت کی تقسیم، میاں بیوی کے مابین رنجش، موجودہ عہد میں تیزی سے خاندانی نظام کے بکھرتے شیرازے کو بھی اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ خالد فتح محمد کے افسانے "دھنک" کا ایک کردار اپنی تنہائی، اداسی اور بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"زمین گول ہے اور میں چلتے ہوئے اپنے شہر میں آ گیا۔ شہر اسی طرح تھا جیسا میں دس برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف میرے پرانے شناسا مجھے پہچانتے نہیں تھے اور جو چند ایک میری شناسائی کا دعوی کرتے تھے انھیں میں نہیں پہچانتا تھا یا کسی مصلحت کے تحت پہچاننے سے انکار کرتا تھا۔ چنانچہ جس شہر میں اپنے جاننے والوں کا ایک ہجوم چھوڑ کر گیا تھا وہاں میں اکیلا تھا۔"(۸)

مشرقی سماج میں عورت شرم وحیا کا پیکر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے اخلاقی اقدار میں یہ چیز شامل ہے کہ جب عورت رخصت ہو کر جاتی ہے تو اس کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بہر صورت شوہر کے ساتھ وفا کرے اور خاندان کو پروان چڑھانے میں معاونت فراہم کرے۔ سماج میں خاندان کی بہت زیادہ اہمیت ہے جو باہمی اشتراک سے معاشرتی ڈھانچے کو برقرار رکھتا ہے۔ اختر حسین رائے کے مطابق:

"سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراکی عمل کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔ ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے۔ ہر فرد کی مادی ضرورت کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہے اور سماج کی ابتدا اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہو۔ یعنی سماج کا سنگِ بنیاد انسان کی ضرورت پر ہے۔"(۹)

خالد فتح محمد نے اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا بالخصوص امرا طبقے کے معمولات کا پردہ فاش کیا جو بیوی کے ہوتے ہوئے بھی باہر کی عورتوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی ازدواجی زندگی کی ساری ناخوشگواریت عورت کو چپ چاپ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ افسانے "چبھن" میں بھی ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جس کی شادی ایک ایسے مرد کے ساتھ ہوتی ہے جو ویسے تو فیکٹری کا مالک ہے لیکن باہر کی عورتوں کے ساتھ کھلے عام مراسم رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس کی بیوی کرب سے گزرتی ہے اور اولاد کی خاطر سمجھوتا کر لیتی ہے لیکن باپ کے نامناسب رویے کا اثر اس کی اولاد پر بھی پڑتا ہے یوں ایک خاندان مرد کی بے پروائی اور ڈھٹائی کے باعث اذیت ناک انجام سے دوچار ہوتا ہے:

> "اس نے فیروز کو یکسر مسترد کر دیا۔ گھر میں دونوں الگ الگ رہنے لگے۔ فیروز کی رکاوٹ کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ وہ گھر کو بہ طور گیسٹ روم استعمال کر رہا تھا۔ شراب، جوا اور عورتیں اس کی زندگی کے اہم اجزا تھے۔ وہ اپنے کاروبار سے بے خبر تھا۔ فیکٹری کے بیشتر فیصلے ساجدہ کرتی لیکن آمدنی کا زیادہ حصہ فیروز ہڑپ کر جاتا۔ ساجدہ کوشش کے باوجود اس بے ایمانی کو نہ روک سکی۔"(۱۰)

خالد فتح محمد حقیقت پسند کہانی نویس ہیں، محبت، اخلاص اور سچائی پر انھیں یقین ہے۔ ان کے اسلوب میں ندرت اور تازگی ہے۔ مشاہدے میں گہرائی و گیرائی ہے۔(۱۱) انھوں نے پنجاب کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ تیزی سے بدلتے معاشرے میں نیا فرد ثقافتی اور تہذیبی شناخت سے بہرہ ور نہیں۔ وہ رفتہ رفتہ اپنی اقدار کو کھو رہا ہے۔ خالد فتح محمد کو اس بات کا بہ خوبی احساس ہے اور وہ اپنے افسانوں میں بار بار اس المیے کی نشان دہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی سلسلے کی کڑی ان کا افسانہ "سلسلہ" ہے جس میں نسل در نسل چلنے والے سلسلے میں پیری مریدی کا روایتی تصور ملتا ہے جو کہ پنجاب میں آج بھی مقبول ہے۔ لوگ باپ دادا کی کی ہوئی بیعت کو نبھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں جعفر خان کا پوتا شیر افگن ہر سال سرکار کے ہاں حاضری کے سلسلے کو بزرگوں کی دقیانوسی روایت خیال کرتے ہوئے توڑ دیتا ہے۔ خالد فتح محمد نے اس افسانے کے کردار "سرکار" کی زبانی یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ روایتیں ثقافتی شناخت کی علامت ہوتی ہیں۔ موجودہ معاشرے کا فرد مادر پدر آزادی چاہتا ہے اور وہ ہر قدیم رسم و رواج کو دقیانوسی خیال کرتا ہے۔ اس افسانے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کی انسان کی بقا اس کی تہذیبی و ثقافتی شناخت برقرار رکھنے میں ہے۔ اس افسانے کا کردار "سرکار" اور شیر افگن کے مابین گفتگو ملاحظہ کیجیے:

> "Exterior lines یعنی بیرونی خطوط، وہ بھی مستقل ہیں مگر ہمیں ان سے جدا رہنا ہے۔ وہ ہمارا حصہ تو ہو سکتے ہیں مگر ہماری شناخت نہیں بن سکتے۔ آپ سرکار سوئم نے کہا۔ شیر افگن کی

سمجھ میں بہت سی باتیں آنا شروع ہو گئیں۔ جعفر خاں کا طویل سفر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ بخت خاں کا زمانہ تو ابھی کل کی بات تھی۔ باپ دادا کی آپ سرکار سے ملاقاتیں تو صرف درگاہ تک محدود رہی تھیں۔"[۱۲]

میتھیو آرنلڈ ادب کو تنقید و تعبیرِ حیات قرار دیتا ہے[۱۳] خالد فتح محمد نے بھی اپنے تمام افسانوں کے موضوعات کو سماجی زندگی سے ہی کشید کیا ہے اور ان کی تخلیقات انسانی زندگی کی تفسیریں پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے متضاد پہلوؤں، انسانی رویوں اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کیا ہے۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کے معائب و محاسن کی نقاب کشائی کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مختلف عمر کے افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا احاطہ بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ خالد فتح محمد کا ہر افسانہ انسانی فطرت کی تفسیر پیش کرتا ہے۔ وہ فرد کی داخلی سطح کا مطالعہ عمیق نظری سے کرتے ہیں۔ دیگر سماجی حقیقت نگار افسانہ نگاروں کی طرح انھوں نے جنسی ناآسودگیوں اور گھٹن کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے تاہم ان کا قلم جنسی موضوعات پر اٹھتے ہوئے اخلاقی اقدار کو پامال نہیں کرتا۔ ان کے کردار اسی معاشرے کے افراد ہیں بالخصوص عورتیں جو مشرقی سماج میں اگرچہ طوائف کے روپ میں بھی موجود ہیں لیکن وہ چاہ کر بھی اس پیشے کو ترک نہیں کر سکتیں۔ اس کی مثال ان کا افسانہ "خلش" ہے جس کا مرکزی کردار "شہناز" ہے۔ جب رضا "شہناز" سے اس کے پیشے سے متعلق سوال کرتا ہے تو وہ کہتی ہے:

"میں دلدل اور فضلے سے نہیں بچ سکتی۔ میں ان کا حصہ ہوں۔ میری نانی کوئی بائی تھیں۔ میری ماں کا نام اللہ وسائی ہے۔ گھر میں شاہنو ہوں اور باہر شہناز۔ نانی اور ماں چکلے میں شام سستی خوشبو لگائے بازو میں گجرے پہن کر گاہک کا انتظار کرتی تھیں۔ وہ مفعول تھیں اسی لیے منتظر تھیں۔ ہم فاعل ہیں اس لیے ڈھونڈتی ہیں لیکن دونوں کا منتہائے مقصود ایک ہی ہے۔"[۱۴]

خالد فتح محمد نے مرد اور عورت کی نفسیات کو بنیاد موضوع بنا کر گہری نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ محبت اور جنس کے حوالے سے انھوں نے معاشرے میں حقیقی کرداروں کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ اس ضمن میں "خانۂ سنگ"، "ٹیس"، "سایوں کا کھیل" اور "دھنک" قابل ذکر افسانے ہیں۔ خالد فتح محمد کے کردار خیر و شر کا مرقع ہیں اور اسی سماج کا حصہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سماج کی برائیاں افراد میں سرایت کر جاتی ہیں اور مختلف حالات میں انسان کس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت کے تضادات کو بڑے واضح انداز میں بیان کرتے ہیں کہ انسان اپنے اندر معصومیت کے ساتھ ساتھ حیوانیت اور شر کے جذبات بھی رکھتا ہے اور مخصوص صورت حال میں کوئی بھی رویہ اختیار کر سکتا ہے۔ خالد فتح محمد اس مساعی میں انسان کے لاشعور

تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ کرداروں کے ذہنوں میں اتر کر بھید جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور باطنی سطح پر موجود انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ نیکی اور بھلائی کو منظر عام پر لے آتے ہیں۔ وہ اکیسویں صدی کے بدلتے ہوئے ماحول کا پوری طرح ادراک رکھتے ہیں۔ موجودہ عہد میں فرد کی افراط و تفریط اور ٹیکنالوجی کے عفریت نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ وہ تمام تر ترقی کے باوجود داخلی سطح پر تنہائی کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور اس تنہائی نے اسے کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے ان کا افسانہ "پانچ منٹ کی زندگی" بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کا مرکزی کردار تمام تر آسائشوں کے باوجود اپنے اندر کے خلا کو پُر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کاروبار کی مصروفیات اور دیگر عیاشیوں کی بدولت اپنی اولاد اور بیوی سے دور ہو جاتا ہے اور بالآخر مکمل طور پر تنہا ہو جاتا ہے۔ اتنا سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض پانچ منٹ ہی جی سکا ہے اور وہ اس کے آخری پانچ منٹ ہوتے ہیں جن میں اس کی پوری زندگی سما جاتی ہے۔ خالد فتح محمد نے وقت کی بے رحمی کو اس افسانے میں خود کلامی کے انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> "تمہارا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ شاید کوئی کمرے سے باہر چلا گیا ہے۔ میں لاشعوری طور پر گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی سوئیاں چمک رہی ہیں اور اس وقت ایک بج کر پچپن منٹ ہوئے ہیں۔ میری عمر پچاسی برس ہے اور پانچ منٹ کے بعد میں مر جاؤں گا۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میری زندگی کتنی مختصر ہے۔"(۱۵)

خالد فتح محمد کے پیش نظر زندگی کی ایک واضح اور مکمل تصویر پیش کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب سے حقیقی زندگی کے صحیح تاثر کو ابھارا ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے محبت اور انسانی ہمدردی کے جذبات کو بھی بیدار کیا ہے۔ ان کے افسانے معاشرتی صداقت اور حقیقت پسندی کے مظہر ہیں۔ ان کے ہاں سماج میں پھیلی بے راہ رویوں، شدت پسندی، بھوک افلاس، طبقاتی کشمکش نفسیاتی اور سماجی تناظر میں مختلف زاویوں سے ملتی ہے۔

خالد فتح محمد کو فنِ افسانہ نگاری پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوعات، مواد اور بیانیے کی ہم آہنگی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں گہرا سماجی شعور ملتا ہے جو فرد کی داخلی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کو بہ طریقِ احسن منظر عام پر لاتا ہے۔ وہ ناہموار معاشرے کی عکاسی اس طور کرتے ہیں کہ زندگی کے تمام تر پہلو آشکار ہو جاتے ہیں۔ خالد فتح محمد کے افسانوں کے اجمالی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ذیل میں تمام تر پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید احتشام حسین، ادب اور سماج، ممبئی: کتب پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۴۸، ص ۳۹

۲۔ اعجاز راہی، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳

۳۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵

۴۔ اسد ملک، فلیپ، داغ داغ اجالا، گوجرانوالہ: ایم پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷

۵۔ قمر رئیس، تلاش و توازن، دہلی، خرام پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء، ص ۸

۶۔ خالد فتح محمد، تانبے کے برتن، گوجرانوالہ: سانجھ پبلی کیشنز، ط اول، ۲۰۱۴ء، ص ۳۱

۷۔ ایضاً، ص ۴۱

۸۔ خالد فتح محمد، میں، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ط اول، ص ۲۱

۹۔ خالد فتح محمد، جمع تقسیم، گوجرانوالہ: ایم پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۲

۱۰۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعت اردو، ص ۷

۱۱۔ خالد فتح محمد، داغ داغ اجالا، گوجرانوالہ: ایم پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳

۱۲۔ خالد فتح محمد، جمع تقسیم، گوجرانوالہ: ایم پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۳۸

۱۳۔ سید عبد اللہ، اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱، ص ۹۹

۱۴۔ خالد فتح محمد، داغ داغ اجالا، گوجرانوالہ: ایم پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۵

۱۵۔ خالد فتح محمد، پانچ منٹ کی زندگی، گوجرانوالہ: ادراک پبلی کیشنز، ط اول، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵

References in Roman Script:

1. Syed Ehtisham Hussain, Adab Aur Samaj, Mumbai: Kutub Publishers Ltd. 1948, P39
2. Ejaz Rahi, Urdu Afsany Mai Usloob Ka Ahang, Rawalpindi: Rays Publications, 2003, P23
3. Rauf Parekh, Dr. Urdu Nasr Mai Mazah Nigari Ka Siasi o Samaji Pas e Manzar, Karachi: Anjuman e Taraqi e Urdu Pakistan, 1994, P35
4. Asad Malik, Flap, Dagh Dagh Ujala, Gujranwala: M Publications, 2003, P17
5. Qamar Raees, Talash o Tawazun, Dehli: Kharam Publications, 1968, P8
6. Khalid Fateh Muhammad, Tambay Kay Bartan, Gujranwala: Sanjh Publications, V1, 2014, P31
7. Same as above, P41

8. Khalid Fateh Muhammad , Mai, Lahore: Aks Publications, 2019, V1, P21
9. Khalid Fateh Muhammad , Jama Taqseem, Gujranwala: Aim Publications, 2004, P112
10. Akhter Hussain Raipuri, Adab Aur Inqilab, Hyderabad Dakkan: Idara Ashat e Urdu, P7
11. Khalid Fateh Muhammad, Dagh Dagh Ujala, Gujranwala, Aim Publications, 2003, P13
12. Khalid Fateh Muhammad , Jama Taqseem, Gujranwala: Aim Publications, 2004, P38
13. Syed Abdullah, Isharat e Tanqeed, Lahore: Sang e Meel Publications, 2011, P99
14. Khalid Fateh Muhammad, Dagh Dagh Ujala, Gujranwala, Aim Publications, 2003, P35
15. Khalid Fateh Muhammad, Panch Minute Ki Zindagi, Gujranwala: Idraak Publications, V1, 2005, P35

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.293

ڈاکٹر اللہ یار ثاقب
صدرِ شعبہ اردو، حزب الرحمن اسلامک سائنس کالج، کمالیہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ
ڈاکٹر سائرہ ارشاد
لیکچرار اردو، گورنمنٹ صادق ویمن کالج یونیورسٹی، بہاول پور

مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں سماجی و نفسیاتی تناظرات

Dr. Allah Yar Saqib
HOD Urdu, Hizb-ur-Rehman Islamic Science College, Kamalia, Toba Tek Singh
Dr. Saira Irshad
Lecturer Urdu, Govt. Sadiq Woman University, Bahawalpur

Socio-psychological perspectives in Mustafa Karim's fiction

ABSTRACT

Mustafa Karim is an epoch-making fiction writer of Urdu who, while maintaining the tradition of fiction, has also given new freshness to the eastern and western perspective of fiction. His fictions are excellent in terms of technical, artistic and thematic aspects, while the themes are East and West society, World War I and II, partition of India, migration problems, violence in religions, human tolerance, class division and psychology, problems of immigrants. , made the theme of sexual freedom and promiscuity. Most of his fiction depicts the life of immigrants and emigrants. Echoes of the past, consciousness and narrative style have been adopted in these legends. Every Short story is a manifestation of tragedy, sorrow, and suffering. This article gives a brief overview of his short stories.

Keywords: *Fiction, Society, Literature, Consciousness, culture,*

مصطفیٰ کریم صوبہ بہار (بھارت) کے شہر "گیا" میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔[1] ابتدائی تعلیم پٹنہ کے کانوونٹ سکول سے حاصل کی۔ کالج کے دنوں میں تحریک پاکستان کے جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا اور پاک فوج میں بطور میڈیکل آفیسر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۲ء میں استعفیٰ دے دیا اور قومی مرکز صحت میں خدمات سرانجام دینے لگے جہاں سے

Received: 13thFeb, 2023 | Accepted: 10th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

۱۹۷۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں برطانیہ چلے گئے اور وہیں پر ۲۰۱۶ء میں وفات پا گئے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۴۹ء میں کیا جب وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور لکھنے کا یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان کے افسانے ایک طرف تو روایات سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ان کے افسانوں میں جدیدیت، روشن خیالی اور ترقی پسندی جیسے عناصر موجود ہیں۔

مصطفیٰ کریم کے ادبی سرمائے میں تین ناول، دو ناولٹ، تین افسانوی مجموعے اور متعدد تحقیقی و تنقیدی کتابیں شامل ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "گگلو" ۱۹۸۵ء میں، دوسرا افسانوی مجموعہ "دو شاخیں لچکتی ہوئی" ۱۹۹۸ء میں جب کہ تیسرا افسانوی مجموعہ "عجائب گھر" ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے زیادہ تر افسانے تارکینِ وطن اور ہجرت کر جانے والوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں ماضی کی بازگشت، شعور کی رو اور بیانیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ المیہ، دکھ اور کرب کا مظہر ہے۔

مصطفیٰ کریم اردو کے ایک عہد ساز افسانہ نگار ہیں جہاں انہوں نے افسانے کی روایت کو قائم رکھا وہیں افسانے کو مشرقی و مغربی تناظر میں نئی تروتازگی بھی بخشی۔ ان کے افسانے تکنیکی، فنی اور موضوعاتی لحاظ سے عمدہ ہیں جب کہ موضوعات میں مشرقی و مغربی معاشرت، جنگِ عظیم اول و دوم، تقسیم ہند، ہجرت کے مسائل، مذاہب میں تشدد، انسانی رواداری، طبقاتی تقسیم کے علاوہ نفسیات، تارکین وطن کے مسائل، جنسی آزادی اور بے راہ روی کو موضوع بنایا۔ مصطفیٰ کریم نے دنیا میں محکوم و مظلوم اسلامی ریاستوں (بوسنیا، فلسطین) کی آزادی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کی افسانہ نگاری سے متعلق ارمان نجمی رقم طراز ہیں:

> "مصطفیٰ کریم نے اپنے زمانے اور وقت میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کو ان کے معاشی، معاشرتی، نفسیاتی و سیاسی تناظر میں پیش کر کے اپنے گردوپیش کی سچائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔ یہ ہم عصری ان کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ان میں جبر کی زد میں رہنے والے افراد کے گھر، خاندان، پیدائش، موت، محبت، کبر سنی، امید و ناامیدی کی جانی پہچانی آویزشوں کا اندراج ہے۔ یہ جبر کئی جہتوں سے نازل ہوتا ہے۔ کہیں تنہائی یا جدائی کی شکل میں تو کہیں محبت اور رفاقت کی شکل میں بھی، کہیں ذہنی خلل تو کہیں دماغی یا نفسیاتی مرض کی صورت میں۔ انسانوں کی شخصیت کے بکھرتے ہوئے تار و پود ہمیں فرد اور معاشرہ دونوں کے زوال کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ یہ زوال، انحطاط، بے تعلقی تو کہیں بے معنویت کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ فرد کو بے حد و حساب آزادی بلکہ چھوٹ مل جائے تو لا مرکزیت کی بے ہئیتی میں اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے"۔ (۲)

مصطفی کریم نے اپنی زندگی کا جو حصہ جہاں گزارا وہیں سے افسانوں کا خمیر اکٹھا کیا۔ ہندوستان، بنگلہ دیش، کشمیر، پاکستان اور یورپ، خاص طور پر اسکاربرو کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے قابلِ دید ہیں۔ مجموعی طور پر مصطفی کریم کے افسانوں میں جو جہتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ان میں معاشرتی، جنسی، نفسیاتی اور علامتی پہلو نمایاں ہیں۔ کسی تخلیق میں تخلیق کار کا عکس، معاشرت یا کردار جھلکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک تخلیق کار اپنی تخلیق کا مواد کسی بھی دھرتی سے لے سکتا ہے۔ مصطفی کریم کا مواد کسی ارضیت کا مقید نہیں ہے۔ وہ قریہ قریہ پھرتے اور نگری نگری سے کردار تلاش کرتے ہیں۔

مصطفی کریم کا المیہ یہ ہے کہ وہ متحدہ ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان سے قربت کے باوجود دوری پر ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں جدائی کا درد شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "دو شاخیں لچکتی ہوئی"، "آزادی کی پچاسویں سالگرہ" اور "پتا جی سے ملاقات" کو بطور خاص دیکھا جا سکتا ہے ہیں، ان افسانوں میں مصطفی کریم کسی نہ کسی طور اپنے کرب کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

کسی تخلیقی کام کا محرک کوئی نہ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔ تقسیم ہند اس دور کے ادبا کے ہاں ایک لمبے عرصے تک زیر بحث رہی۔ جس کے نتیجے میں تخلیق کار کو ان گنت تجربات سے گزرنا پڑا۔ کئی خون آلود شاموں کے مناظر دیکھنے کے علاوہ نفسیاتی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مصطفی کریم کا "آزادی کی پچاسویں سالگرہ" ایسا افسانہ ہے جو پاک بھارت آزادی کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسی الجھن ہے جو افسانے میں نفسیاتی ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ دیارِ غیر میں پندرہ اگست، ہندوستان کے جشن آزادی کی تقریب میں شمولیت، عجیب طرح کی کشمکش میں مبتلا کرتی ہے مگر "قربت" کا رشتہ دونوں ممالک کے لوگوں کو میل جول پر مجبور کرتا ہے۔ ایشیائی ہونے کی بدولت تہذیب و تمدن میں مماثلت پائی جاتی ہے جب کہ مشترک زبان کی وجہ سے ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھنا آسان ہے۔ اسی لیے اختلاف کے باوجود یہ ایشیائی ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی غمی میں شریک ہوتے ہیں۔

اردو ادب میں تحریکِ آزادی، تقسیمِ ہند، فسادات، ہجرت، سقوطِ ڈھاکہ جیسے موضوعات کافی سرگرم رہے ہیں۔ ہر ادیب اور خاص طور پر افسانہ نگار نے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد "ہجرت" موضوع افسانے میں سب سے زیادہ برتا گیا۔ فسادات اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوفناک مگر عارضی تھے اس کے برعکس ہجرت کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل آج بھی موجود ہے۔ یہ ہجرت (پاکستان و بھارت کی ہو یا سات سمندر پار کی) زندگی کے تمام شعبوں بالخصوص سیاست، ثقافت، معیشت اور انتظامیہ کو متاثر کرتی ہے۔ مصطفی کریم کی تحریروں میں ہجرت ایک اہم ترین موضوع ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں کہیں نہ کہیں ہجرت کی جھلک ضرور نظر آئے گی۔

مغرب میں رہائش پذیر عہدِ حاضر کا انسان اپنی تمام تر مصروفیات، رونقوں اور بزم آرائیوں کے باوجود تنہائی کا شکار ہے خواہ وہ مغربی باشندہ ہو یا تارکِ وطن، باہر کی تنہائی نے اسے اندر سے بھی تنہا کر دیا ہے۔ دیکھنے میں یورپ کے شہر رونق سے بھرپور نظر آتے ہیں مگر وہاں کے مکین اندر سے کھوکھلے ہیں، اس تنہائی کی کئی وجوہات ہیں، خاص طور پر تارکین وطن کے سماجی و نفسیاتی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کے شہروں کو جنگل قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں کوئی ہمدرد و غم گسار نہیں ملتا۔ ان وجوہات میں ایک وجہ خاندانی نظام کی شکست وریخت ہے۔ آج کا مغربی معاشرہ اپنے ہی بنائے ہوئے نظام کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد اولاد والدین سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتی ہے اور بوڑھے والدین تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مصطفی کریم کے افسانوں میں کوئی بھی کردار (مرد ہو یا عورت) انفرادی یا اجتماعی سطح پر دکھ، درد یا المیے سے خالی نہیں، خواہ کیفیت ہجرت کی ہو یا معیشت و معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہو، اپنے جاندار انداز سے خود کو منواتا ہے۔ مصطفیٰ کریم نے اپنے افسانوں میں جن مسائل سے پردہ چاک کیا ہے ان میں پاکستان کے کسانوں و مزدوروں کے علاوہ تیسری دنیا میں بے روزگار افراد شامل ہیں جو ایسی کرب آمیزی کا سامنا کرتے ہیں کہ پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

مصطفی کریم کی زندگی کا زیادہ تر حصہ یورپ میں گزرا اس لیے وہ وہاں کے رسم و رواج سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہاں کی مذہبی رسوم کو بھی بہت قریب سے دیکھا۔ وہ اسلام اور عیسائیت میں یہ فرق محسوس کرتے ہیں کہ مولوی اپنی تقریروں میں جنت اور دوزخ سے آگاہ کرتے ہیں لیکن پادری مرے ہوئے آدمی کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ مصطفی کریم جزوی طور پر مذہبی ہیں لیکن کلی طور پر ان کا رجحان روشن خیالی کی طرف ہے، وہ مذہب کو حقیقت کے سامنے رکاوٹ نہیں بننے دیتے بلکہ جو سچ ہے وہی صاف لفظوں میں کہہ دیتے ہیں۔ وہ مذہب میں تعصب کے قائل نہیں بلکہ معتدل مزاج رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں "زخمی ہوا"، "وجہ" اور "مداوا" میں یہ عکس دکھائی دیتا ہے۔

مصطفی کریم نے جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا (سیاہ یا سفید) اسے من و عن قاری کے سامنے پیش کیا۔ ان کے جنسی حوالے سے منظرِ عام پر آنے والے افسانوں میں " دوشاخیں لچکتی سی"، " جل"، " تین مرد"، " صلہ"، " گلو"، " فیصلہ"، "سات منٹ"، " ناکردہ گناہ"، "وہ ایک خلش مخصوص سی"، "وجہ"، " انوکھی سزا"، " بھیڑیا"، "ایک چوتھائی"، "دلدل" اور "عجائب گھر" شامل ہیں۔ مصطفی کریم کے موضوعاتی تنوع کو ناقدین کی طرف سے ترقی پسند، حقیقت پسند، فحش نگار یا روشن خیال کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدے و تجزیئے کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ بقول سیدہ حنا:

"اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بالکل اوریجنل ہے۔ اس کا کوئی افسانہ پڑھتے ہوئے ہمیں کوئی مصنف، کوئی افسانہ یا افسانہ نگار یاد نہیں آتا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی بہت سی سوچیں اور اپنے ارد گرد بہت سے لوگ یاد آجاتے ہیں۔"(۳)

مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں ایسے جملے و مناظر کشی دکھائی دیتی ہے جو عریانی و فحاشی کے زمرے میں آسکتی ہے مگر سماجی و معاشرتی لحاظ سے جنس نگاری کی بجائے حقیقت کے زیادہ قریب قرار دیا جاسکتا ہے:

"سوسن کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اینڈریو نے بلاؤزر کی زِپ کھول دی، سوسن نے اسے جسم سے الگ کیا اور پھر انگیا کو اتار پھینکا، اینڈریو نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔"(۴)

مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں حقیقت نگاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زندگی کی سچائیوں کا کشف کرتے ہیں۔ ان کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور محسوسات افسانوں میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مصطفیٰ کریم کے افسانے معاشرے کے نشیب و فراز کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے مصطفیٰ کریم کے متعلق رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کا پیشہ ڈاکٹر ہے اور شوق افسانہ نگاری ہے۔ گویا وہ ہر لحاظ سے انسانوں کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے کوشاں ہیں۔ مغرب کے چند اچھے افسانہ نگاروں میں شامل ہونے کے باوجود ادبی منظر پر اس آب و تاب کے ساتھ نظر آتے (ہیں) جس آب و تاب کے ساتھ ان سے بعض کم تر درجے کے افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ لفظ کی حرمت اور طاقت میں یقین رکھتے ہیں اور ادبی شہرت کے لیے غیر ادبی ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتے۔"(۵)

مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں تحلیلِ نفسی، یاسیت، تنہائی، نارسائی اور زہر خند تکنیک کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں معاشرتی المیے کی عکاس ہیں، وہ کسی ایک گھر کا نہیں بلکہ اجتماعی رویوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ مصطفیٰ کریم نے جہاں زندگی کا کچھ حصہ گزارا اسے اپنی یاداشت میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ماضی بعید کے دھندلکوں کی جھلک کے علاوہ اپنے آبا کی خاک کے متلاشی بھی نظر آتے ہیں۔

مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی مربوط ہیں۔ ان کے افسانوں میں تکنیکی لوازمات موجود ہیں۔ اردو فکشن میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے ذریعے نہ صرف مناظرِ فطرت کی عکاسی مقصود ہوتی ہے بلکہ اپنے عہد کی ترجمانی بھی بہتر انداز میں کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سراپا نگاری اور تصویر کشی بھی ایک فن ہے، جب ایک مصور رنگوں سے مناظر کی عکاسی کرتا یا کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ

اپنے فن کی بدولت تخلیق میں حقیقت کے رنگ بھر دیتا ہے۔ ایک قلم کار بھی لفظوں کے رنگوں سے خوب صورت تصویریں پیش کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ عظیم مصوروں کی طرح قلم کار بھی ماہر نقاش ہوتا ہے، وہ لفظوں سے میناکاری کرتا ہے۔ مصطفی کریم کو ایک ایسے مصور کا پرتو قرار دیا جاسکتا ہے کہ عمدہ فن کی بدولت اس کے شاہکار کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مصطفیٰ کریم کے مصورانہ فن کی ایک جھلک اس اقتباس میں دیکھیے کس طرح وہ اپنے کردار کو پیش کر رہے ہیں:

"تمہاری طویل قدو قامت، کسرتی جسم، دھوپ میں جلا ہوا سفید رنگ، سیاہ بال، چہرے پر گربروت، آفٹر شیو کی خوشبو تو جسم سے بگشوش کولون اور ایسٹ جیڈ کے پاؤڈر کی مست کر دینے والی مہک۔"(۶)

مصطفی کریم کو فطرت سے خاص لگاؤ ہے۔ ان کی نظریں کبھی آسمانوں میں اڑتی تتلیاں دیکھتی ہیں، کبھی پہاڑ اور کبھی وادیاں۔ فطرت کے یہ حسین مناظر دل کو خوش کن بنا دیتے ہیں۔ فطرت کی رنگارنگی کا ماحول رومان پرور بنا دیتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

آسمان میں اُڑتی بدلیاں، ایک کے پیچھے دوسری، اور اُن میں ٹنگا سورج، دھوپ چھاؤں کا کھیل، پہاڑیاں، ٹیلے، درخت اور پگڈنڈیاں، خم دار، اوپر نیچے جاتی ہوئی، کبھی وادیوں میں گم اور کبھی کسی پہاڑ پر نمایاں، اُن پر چلتے ہوئے اکّے دکّے راہ گیر، اور ہوا خنک، نرم اور آزاد۔(۷)

اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مصطفیٰ کریم نے کس مہارت قدرتی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ فضاؤں میں اڑتے بادل اور ان بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا سورج، کھیتوں کھلیانوں اور وادیوں میں گم ہوتی پگڈنڈیاں الغرض مناظرت فطرت کی خوب عکاسی ملتی ہے۔

مصطفی کریم کے افسانوی کرداروں پر بات کی جائے تو ان کے کرداروں کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ ان کے تخلیقی کرداروں میں صداقتِ اظہار کی روش موجود ہے۔ مصطفی کریم کے افسانوں میں وسعت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔ ان کے کرداروں میں ہجرت کرنے والے، تارکین وطن، ماضی میں جھانکتے اور تنہائی کا شکار لوگ ہیں۔ جب کہ موضوعاتی حوالے سے ہوس زر اور خود غرضی جیسے عوامل کارفرما ہیں۔ مصطفی کریم کے زیادہ تر کردار بورژوائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کردار تحلیل نفسی (Psycho Analysis) کے ذریعے خود کو منواتے ہیں۔ مصطفی کریم کے اکثر کردار ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ افسانہ "ملکہ معظمہ" کی نائلہ جیسے بہت سے کردار کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہیں،

اسی طرح "زندگی اے زندگی" کا "نعیم" بھی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے۔ ان کے کرداروں میں سچائی جھلکتی ہے۔ یوں بھی مصطفی کریم خود سچائی سے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے افسانوں میں plausibility کو بہت اہمیت دی ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر ناول اور افسانوں کے مبصروں کی آرا ہیں۔ منٹو یقیناً بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ پھر بھی ان کے دیگر افسانوں میں بھی اس عنصر کی کمی ہے۔ ممکن ہے اس موقعے پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ فکشن ہے اور اس میں سچائی یا Plausibility کی تلاش غلط ہے اور اس میں کرداروں کی درست شکل دیکھنی ہے، تو اخبار سوانح عمری پڑھیئے۔"(۸)

کردار نگاری کے ساتھ، افسانے کا پلاٹ، منظر کشی اور تہذیب و معاشرت افسانے کی مقبولیت کا سبب بنتے ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو قاری کو اس معاشرتی ماحول سے آگاہ کرتے ہیں، جہاں سے اس افسانے کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ مصطفی کریم نے افسانوی طرزِ نگارش کو خوب نبھایا ہے۔ ان کے یہاں مقامی لب و لہجہ اور رسم و رواج کا حقیقی عکس نظر آتا ہے۔ کسی کردار کی زبان سے اس کی مقامی زبان کا لہجہ افسانے میں خوب سجتا ہے۔ مقامی زبان اور لب و لہجے کی جھلک دیکھیے۔:

"صاب نالا چڑھ آیا ہے۔ اَم لوگ اس کو نئیں (نہیں) پار کر سکتا اَے (ہے) نیچے دلاں کی سرائے اَے اَم (ہم) واں (وہاں) رک سکے گا۔"(۹)

اسی طرح۔:

"صاب کیا معلوم۔ دنیا بدلتا رتا اے۔ دنیا عجیب اے۔ لوگ باگ عجیب اے۔ اور اندو (ہندو) آیا۔ پھن (بدھ مت کا لوگ آیا۔ پھن مغل، ایرانی۔ بعد میں سکھ۔ شاید ادر (ادھر) کوئی سڑک جاتا او (ہو) اور اس پر کوئی بادشاہ سرائے بنا دیا۔ اب سڑک نئیں اے۔ بس یہ ہے۔"(۱۰)

مصطفی کریم نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا اس وقت افسانوی ادب میں نیا موڑ آچکا تھا۔ ترقی پسند تحریک تنظیمی طور پر ختم ہونے کو تھی لیکن ترقی پسند مصنفین انفرادی طور پر اپنے جذبات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر رہے تھے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور لسانی تشکیلات جیسی اصطلاحیں اردو ادب میں وارد ہو چکی تھیں۔ سیدھی سادی بات کو گھما پھرا کے بیان کرنے کا ہنر زور پکڑ چکا تھا۔ اردو افسانے میں بھی یہ جہتیں اس حد تک حاوی ہو چکی تھیں کہ عام کہانی کو قبول ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نئے افسانے میں کیا چیز لازمی تھی اور کیا نہیں اس

بات پر بھی بڑا زور تھا۔ اردو افسانے کے اس نئے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے اسلوب کو درج ذیل چار منفرد زمروں میں تقسیم کیا ہے:

"الف۔ استعاراتی، رمزی، اور علامتی اسلوب ب۔ تجریدی اور شعری اسلوب

ج۔ ملفوظاتی، حکایاتی اور داستانی طرز بیان د۔ بیانیہ انداز"(۱۱)

مصطفی کریم کے افسانوں میں کوئی ایک اسلوب یا طرز نگارش نہیں، ان کے افسانوں میں جس طرح موضوعات کا تنوع ہے اسی طرح انھوں نے تمام طرز نگارش کو اپنایا ہے۔ استعاراتی ہو، رمزی، علامتی، تجریدی، ملفوظاتی یا بیانیہ رنگ مصطفی کریم کے نوکِ قلم سے گزرا ہے۔

اردو افسانے نے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں نئی کروٹ لی۔ معاشی و اقتصادی حالات اور معاشرتی طور پر ہونے والی بے ثباتی سے انسانی اعصاب پر بیزاری کے تاثرات اُمڈ آئے۔ علامت، استعارے اور تجرید اردو ادب میں در آئے۔ خالدہ مسعود، مسعود اشعر، رشید امجد، انتظار حسین، منشایاد، مرزا حامد بیگ، مظہر الاسلام اور احمد داؤد وغیرہ نے علامت اور استعارے سے افسانے کو نیا روپ دیا۔ بعض افسانہ نگار تو اسے حد تک آگے بڑھ گئے کہ افسانے سے کہانی سرے سے ہی غائب کر دی۔ مصطفی کریم نے تکنیکی طور پر ہر اس انداز کو اپنایا ہے جو جدید افسانے کے زمرے میں آتا ہے۔ علامت اور استعارہ ان کے افسانوی مجموعے "عجائب گھر" میں خاص طور پر نظر آتا ہے۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگار ہیں مگر اس میں مقید نہیں رہنا نہیں چاہتے بلکہ ان کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ جس کو وہ روشن خیالی کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری رقم طراز ہیں:

> "ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اَن کہی کو موضوع بناتے ہیں اور ناگوار سچائیوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے ان کی نقاب کشائی کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے پاس افسانہ نگاری کا ہنر ہے اور یہ ہنر انہیں دنیا کے عظیم افسانہ نگاروں سے راہ و رسم پیدا کرنے کے نتیجے میں نصیب ہوا ہے۔ وہ بنیادی طور پر روشن خیال اور ترقی پسند قلم کار ہیں مگر یہ وہ ترقی پسندی نہیں ہے جو فنکار کو محدود کر دیتی ہے بلکہ اس ترقی پسندی کی بنیاد انسان کی وسیع تر قبولیت اور دوستی پر ہے۔"(۱۲)

مصطفی کریم کے افسانے موضوعات کے ساتھ ساتھ تکنیک میں بھی تنوع اور رنگا رنگی کے حامل ہیں۔ ان کے اسلوب میں کثیر الابعادی (multi dimensionally) پائی جاتی ہے۔ جس سے فہم کی نئی اور خوب صورت اشکال سامنے آتی ہیں۔ جدت کے ساتھ ساتھ مصطفی کریم نے ادبی روایت میں موثر کردار ادا کیا، وہ تشبیہات، استعارات، اصطلاحات، علامات، رمزیت، اشاریت اور زبان و بیان کے سلیقے اور قرینے سے اپنے افسانوں کو مزین کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مصطفیٰ کریم، میں اور میں تخلیقی سفر (مضمون)، مشمولہ: روشنائی، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء، ص:۳۶

۲۔ ارمان نجمی، دوشاخیں لچکتی ہوئی: ایک تفصیلی مطالعہ، مشمولہ: مباحثہ، شمارہ نمبر ۱۹، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۵ء، ص:۷۶

۳۔ سیدہ حنا، سہ ماہی ابلاغ، پشاور، اپریل ۱۹۹۲ء

۴۔ مصطفیٰ کریم، گگلو، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص:۲۰۶

۵۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب: یورپ اور امریکہ میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص:۵۰۵

۶۔ مصطفیٰ کریم، گگلو، ص:۲۷

۷۔ مصطفیٰ کریم، دوشاخین لچکتی ہوئی، پیپل ٹری پریس، اسکاربرو (برطانیہ)، ۱۹۹۸ء، ص:۲۱۴

۸۔ مصطفیٰ کریم، افسانہ۔۔ قدیم جدید؟، مشمولہ: قومی زبان، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص:۲۷

۹۔ مصطفیٰ کریم، عجائب گھر، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۰

۱۰۔ ایضاً، ص:۲۱

۱۱۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۱۲۰

۱۲۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب: یورپ اور امریکہ میں، محولہ بالا، ص:۵۰۴

References in Roman Script:

1. Mustafa Karim, Main aur Maira Takhliqi Safar (Essay), Mashmola: Roshanai, Karachi, Oct. to Dec. 2002, p:36
2. Arman Najmi, Do Shakhian Lachkti hoi: Aik Tafseeli Mutalia, Mashmola: Mobahisa, Issue No. 19, January to March, 2005, p:76
3. Syeda Hina, Sahmahi Iblagh, Peshawar, April 1992.
4. Mustafa Karim, Gigolo, Maktaba Daniyal, Karachi, 1985, p.206
5. Jawaz Jafari, Dr., Urdu Adab: Europe aur America main, Maktaba Alia, Lahore, 2020, p: 505
6. Mstafa Karim, Gigolo, Mawalabala, p:27
7. Mustafa Karim, Do Shakhian Lachkti hoi, People Tree Press, Scarborough (UK), 1998, p:214
8. Mustafa Karim, Afsana…Qadeem Jadeed?, Mashmola: Qaumi Zaban, Karachi December 1994, p: 27
9. Mustafa Karim, Ajaib Ghar, Shahrzad, Karachi, 2013, p.20
10. Ibid, p:21
11. Salim Agha Quzalbash, Dr., Jadeed Afsany ky Rujhanat, Anjuman Traqi Urdu Pakistan, Karachi, 2000, p. 120
12. Jawaz Jafari, Dr., Urdu Adab: Europe aur America main, Muhawalabala, p. 504

DARYAFT: ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 15, Issue 01,(June 2023): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v15i01.314

ڈاکٹر روبینہ پروین
ٹیچنگ ریسرچ ایسوسی ایٹ، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سفر ناموں کا تکنیکی اور اسلوبیاتی مطالعہ

Dr. Robina Parveen
Teaching Research Associate, International Islamic University, Islamabad

A Technical and Stylistic Study of Travelogues

ABSTRACT

Travel is a very important part of human life. Since time immemorial, every human used to travel from one place to another and would save the events and observations that occurred during the journey in his heart and mind and on his return, he would include other people in his travel experiences. This desire to tell a story led to the writing of travelogue. A travelogue is a narrative genre of prose literature in which a traveler describes in writing the events, experiences, and observations he has witnessed. It not only describes external conditions, but also expresses internal emotions and feelings. Travelogue is a very important genre of Urdu literature and by the time it qualitity and quality is increasing. This article discuses Urdu travelogues, its numerous techniques and styles.

Keywords: *Travelogue, Literature, Experiences, Techniques, Style, Novel, Diary*

تکنیک طریقے یا انداز کو کہتے ہیں۔ ادیب و شاعر جس ذریعے سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے وہ تکنیک کہلاتا ہے۔ تکنیک ایک ایسا طریقہ ہے جس کو اپنا کر تخلیقی جذبے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہر صنف کے لیے ایک الگ تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ داستان،، ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، ہر ایک کی تکنیک دوسرے سے مختلف ہے کسی ایک صنف میں بھی مختلف تکنیکیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اظہار کی قوت مختلف تکنیک کی متقاضی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

> یہ امر ہمیشہ سے مسلّم ہے کہ فن کے لیے تکنیک ضروری ہے لیکن اگر وہ فن میں چھُپ نہ سکے تو فن بناوٹی ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔(۱)

Received: 13thFeb, 2023 | Accepted: 10th June, 2023 | Available Online: 30th June, 2023
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

ہر تخلیق کار اپنے خیالات و احساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ یہی طریقے تکنیک کہلاتے ہیں۔ تکنیک کے استعمال کے لیے تخلیق کار کے ذہن میں کچھ تصورات ہوتے ہیں۔ کسی بھی صنف کے لیے تکنیک نہایت ضروری ہے۔ سفر نامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تکنیک کے نت نئے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ اردو کے ابتدائی سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر نامے، خطوط، ڈائری اور روزنامچے کی تکنیک میں تحریر کیے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی طرح سفر ناموں میں بھی کئی تکنیکیں استعمال کی گئیں ہیں جیسے فلیش بیک، رپورتاژ، مکالماتی، آپ بیتی وغیرہ۔ سفر نامہ نگار اپنی تخلیقات میں تکنیک کا استعمال ایک خاص تاثر پیدا کرنے اور لوگوں کو چونکانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ وہ دوسرے لوگوں سے الگ نظر آئے مگر بعض اوقات وہ شعوری اور لاشعوری بھی تکنیکی حربے استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کی تحریر پُر اثر ہو جائے۔ ابتدائی عہد کے تمام سفر نامے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے تھے۔ اردو کے ان قدیم سفر ناموں میں بالعموم یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ سفر نامہ نگار اپنے سفر ناموں میں دوسرے ملکوں اور خطوں کی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور معاشرتی معلومات فراہم کرتے تھے تاکہ دوسرے لوگ ان کو پڑھ کر مشکلوں اور پریشانیوں سے بچے رہیں۔ سفر نامے کی مختلف تکنیکوں کے بارے میں شفیع عقیل لکھتے ہیں:

> دنیا کی ہر زبان میں سفر نامہ مختلف صورتوں میں موجود ہے، یادداشتوں کے روپ میں، ڈائریوں کی شکل میں، روزنامچوں کے انداز میں، آپ بیتی کی صورت میں، احوال و آثار کی تحریروں میں، خطوط کی طرز پر۔ (۲)

اُردو کے نامور سفر نامہ نگاروں یوسف خان کمبل پوش نے عجائبات فرنگ (۱۸۴۷ء)، مسیح الدین علوی نے سفیر اودھ (۱۸۶۵ء)، منشی محبوب عالم نے سفر نامہ یورپ (۱۹۰۰ء)، محمد حسین آزاد نے سیر ایران (۱۸۸۶ء)، کریم الدین کریم نے سیاحت نامہ (۱۸۳۹ء)، سر سید احمد خان نے مسافرانِ لندن (۱۹۶۰ء) اور شبلی نعمانی نے اپنے سفر نامہ روم و مصر و شام (۱۸۸۱ء) میں ملک کی حالت، انتظامیہ کا طریقِ کار، عدالت کا اصول، ملک کا جغرافیہ، تجارت کی کیفیت اور عمارتوں کے نقشہ جات وغیرہ کو سفر نامے کا حصہ بنایا ہے اور یہ سفر نامے سفری گائیڈ کا فریضہ سر انجام دیتے تھے مگر آج کا سفر نامہ کہانی کی صورت میں لکھا جا رہا ہے۔ سفر نامہ چونکہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے، اس لیے اس میں آپ بیتی کا انداز نظر آتا ہے اور سفر نامے میں دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سفر نامے کی تکنیک میں اہمیت اس بات کی ہے کہ سفر نامہ کس وقت لکھا گیا اور لکھنے والے نے اپنی یادداشتوں کو کیسے محفوظ کیا ہے۔ سفر نامے کی تکنیک کے جو جو تجربات کیے گئے ہیں ان کا مختصراً احوال درج ذیل ہے۔

خطوط کی تکنیک:

جو سفر نامے دورانِ سفر لکھے گئے ہیں ان سفر ناموں میں کئی سفر نامے خطوط کی تکنیک میں ہیں۔ اس طریقے میں مکتوب نگار اپنے تجربات اور احساسات میں مکتوب الیہ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے کیوں کہ خطوط کا مخاطب تو فاصلے پر موجود ہوتا ہے اور وہ مناظر کے حُسن و لطافت میں بالواسطہ شریک ہوتا ہے اور سیاح وہ کیفیت جو اُس نے خود محسوس کی ہوتی ہے مکتوب الیہ کو بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا بیانیہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ سیاح آنکھوں دیکھا حال فوری طور پر دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں ڈاکٹر شہاب الدین لکھتے ہیں:

> اس میں سفر نامہ نگار اپنے گھر کے افراد، دوست، رشتہ دار یا کسی دیگر متعلق شخص کو خط کے ذریعے احوالِ سفر سے واقف کراتا ہے۔ چوں کہ اس تکنیک میں بھی حالات و واقعات دورانِ سفر ہی تحریر کیے جاتے ہیں اس لیے اس میں بھی واقعات و جذبات کی تازگی اور صداقت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔[۳]

جیسے عطیہ فیضی کا سفر نامہ زمانۂ تحصیل (۱۹۲۲ء)، عبد الغفار خاں کا سفر نامہ سیر دکن (۱۹۸۶ء)، شیخ عبد القادر کا مقامِ خلافت (۱۹۵۵ء)، نازلی رفیعہ سلطان کا سیر یورپ (۱۹۰۸ء)، خطوط کی تکنیک میں ہیں۔ اپنے سفر نامے لکھنے کے متعلق نازلی رفیعہ سلطان سیر یورپ کی تمہید میں یوں رقم طراز ہیں۔ ''اصل میں یہ وہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیر یورپ کے حالات کے لکھے ہیں اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی۔''[۴]

ڈائری / روزنامچے کی تکنیک:

ڈائری / روزنامچے کی تکنیک اُن سفر ناموں میں ملتی ہے جو سفر کے دوران لکھے جاتے ہیں۔ ایسے سفر ناموں کے سیاح اپنا زیادہ وقت گھومنے پھرنے اور ارد گرد کے مشاہدے میں گزارتے ہیں اور وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے اپنے دل و دماغ یا کسی ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔ سفر ختم ہونے کے بعد ان یادداشتوں کو سفر ناموں کی صورت میں تحریر کر دیتے ہیں۔ ایسے سفر ناموں میں سیاح چوں کہ تمام مناظر کو پھر سے یاد کر کے لکھتا ہے تو اس میں تخیل کو بھی راہ مل جاتی ہے۔ قدیم سفر ناموں میں بہت سے سفر نامے ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ ان سفر ناموں میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر کے تمام حالات و واقعات کو تاریخی ترتیب سے لکھتا ہے تو ایسا سفر نامہ ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے جس میں عام تجربات و مشاہدات ترتیب وار ہوتے ہیں۔ اس قسم کا سفر نامہ نہ صرف سماجی و معاشرتی تاریخ کو بیان کرتا ہے بلکہ حالات و واقعات پر سیاح کا فوری ردّ عمل بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ اس قسم کے سفر ناموں کے متعلق ڈاکٹر قدسیہ قریشی یوں رقم طراز ہیں:

ایسے سفر نامے جو افسانوں، داستانوں سے زیادہ واقعات، حالات یا رہنمائے سفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی سفر ناموں کے ادب میں زیادہ اہم ہیں۔ یعنی یہ سفر نامے سفری روزنامچوں یا گائیڈ بک کی شکل میں لکھے گئے، جنھیں شروع میں سفر کے متعلق نقشوں اور سفری معلومات کی اطلاع فراہم کرنے والی کتابوں کی صنف میں رکھا گیا۔ (۵)

ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے سفر ناموں میں سچائی کا عنصر قدرے زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ دورانِ سفر سیاح جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو ہو بہو لکھ لیتا ہے۔ اس قسم کے سفر ناموں میں محمد طفیل کا سفر نامہ یورپ کا سفر نامہ (۱۸۸۷ء)، سیّد فدا حسین کا تاریخ افغانستان (۱۸۵۲ء)، نثار علی بیگ کا سفر نامہ یورپ (۱۸۹۰ء)، بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا روزنامچہ بھوپال، آگرہ، دہلی کے حالات (۱۹۲۷ء)، ڈاکٹر وزیر آغا کا انگلستان کا سفر نامہ شامل ہے۔ یہ سفر نامے ڈائری اور روزنامچے کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان میں مشاہدہ تازہ اور سچائی سے بھرپور ہے۔

ناول کی تکنیک:

دنیا کے تمام ادب میں ایسے بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں جن میں علاقائی جزئیات کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ ایک تخیلاتی صنفِ ادب ہے اور اس میں حقیقت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے مگر سفر نامے میں گردوپیش کا مشاہدہ کر کے اپنے تجربات و احساسات کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے سفر کے پس منظر میں خوبصورت ناول اور افسانے لکھے ہیں جیسے فردوس حیدر کا ناول دائروں میں دائرے (۱۹۶۰ء) اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا گرین کارڈ (۱۹۸۵ء) یہ ناول کی ہیئت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ ناول سفر نامہ بھی ہے اور اسے آسانی سے ناولوں کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں۔ ان کی تکنیک کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

سفر ناموں کو ناول کے انداز میں لکھنے کے دو تخلیقی تجربے حال ہی میں منظرِ عام پر آئے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں تجربے خواتین نے کیے ہیں۔ فردوس حیدر کا دائروں میں دائرے اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا گرین کارڈ ایسے سفر نامے ہیں جو کرداروں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اور جن میں ناول کے وسیع کینوس کو استعمال کر کے ان کرداروں کے گرد پوری کہانی بھی بُن دی گئی۔ (۶)

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ کا پیار کا پہلا شہر (۱۸۸۷ء)، قرۃ العین حیدر کا جہانِ دیگر (۱۹۷۴ء)۔ ان کے علاوہ عزیز احمد اور رفعت ملک کے بعض افسانوں اور ناولوں میں بھی غیر ملکی فضا کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

لیکن اگر دیکھا جائے تو افسانے، ناول اور سفر نامے کے فنی تقاضے مختلف ہونے کے ساتھ یکساں بھی ہیں۔ جیسا کہ سفر ناموں میں چوں کہ سیاح ان دیکھی سرزمینوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ نئی دنیا سے واقفیت پیدا کرتا اور انوکھے مناظروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح ناول نگار بھی اپنے ناولوں میں مختلف حادثات وواقعات اور مہمات کو بیان کرتا ہے اور یہی باتیں سفر نامے میں داستان اور افسانے جیسی دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں۔

ڈرامائی / اطلاعی تکنیک:

سفر نامہ اپنے آغاز سے مسلسل ارتقائی سفر طے کر رہا ہے۔ اس میں ہیئت، موضوع اور اسلوب کے نت نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ مختلف تکنیکوں کو بروئے کار لا کر سفر نامے تخلیق کیے گئے اور سفر ناموں میں افسانے اور ناول کی سی تحیّر خیزی پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح سفر نامے میں مکالمے کی مدد سے ڈرامائی ہیئت کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب نے اپنے سفر نامے اے بنی اسرائیل (۱۹۶۰ء) میں میلو ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح اطلاعی نوعیت کی تکنیک کو طیب علی شاکر جبل پوری نے تذکرہ سیفی (۱۹۳۰ء)، میں استعمال کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ایک الگ اور منفرد تکنیک میں ہے۔ اس سفر نامہ میں مختلف اخبارات سے اس سفر کے متعلق معلومات اکٹھی کر کے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سفر نامہ اطلاعی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں سفر نامہ کے مرتبہ طیب علی عبد الرسول مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> اس سفر کے حالات ہم خود اپنے قلم سے نہیں لکھنا چاہتے بلکہ مختلف اخباروں کی مختلف اشاعتوں میں جو مضامین سفر مذکورہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان سب کو ایک ترتیب کے ساتھ مع ضروری نوٹوں کے ہم اس کتاب میں جمع کر دیتے ہیں اور بس۔ (۷)

مگر اس تکنیک میں ابھی تک کم سفر نامے تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ صنف زیادہ مستعمل نہیں ہے۔ آج کے سفر ناموں کے تکنیکی رنگ وروپ میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں سفر نامہ کئی شکلوں میں ملے گا۔

آپ بیتی کی تکنیک:

سفر نامے میں سفر نامہ نگار کی نگاہ نہ صرف خارجی مناظر پر ہوتی رہتی ہے بلکہ اس کی باطنی زندگی بھی ہر لمحہ اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بہت سے حالات وواقعات ان کی اپنی ذات سے بھی وابستہ ہوتے ہیں اور وہ جب ان کو بیان کرنے لگتا ہے تو سفر نامہ آپ بیتی میں ڈھلنے لگتا ہے اور ایسے لگنے لگتا ہے کہ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ کیوں کہ دونوں اصناف میں ادیب یا سفر نامہ نگار اپنے آپ کو براہِ راست پیش کرتا ہے جیسے سر رضا علی کا اعمال نامہ (۱۹۴۴ء)، جعفر تھانیسری کا سفر نامہ کالا پانی (۱۹۲۳ء)، اور حمیدہ اختر کا ہم سفر (۱۹۸۰ء)، دونوں اصناف ایک دوسرے میں ایسے گڈمڈ

ہیں کہ بعض اوقات حمیدہ اختر کی آپ بیتی کو سفر نامہ اور مولانا تھانیسری کے سفر نامے پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ بقول رحمان مُذنب:

> سفر نامہ آج ادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے اس سے عین متصل آپ بیتی ہے۔ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں کیوں کہ دونوں میں فن کار اپنے آپ کو براہِ راست پیش کرتا ہے اور گویا ہوتا ہے۔ اس طرح سے آپ بیتی بھی سفر نامہ ہے۔ یہ بھی ذاتی واقعات، واردات، معاملات، تجربات، محسوسات، جذبات اور نظریات کا مرقع ہوتا ہے۔(۸)

رپورتاژ کی تکنیک:

رپورتاژ اخباری رپورٹ کو کہتے ہیں۔ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی اور خارج سے متعلق نقطۂ نظر اسے سفر نامے سے الگ کر دیتا ہے۔ حج ناموں میں سفر ناموں کی نسبت رپورتاژ کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا لبیک (۱۹۷۵ء)، بلقیس ظفر کا مسافتیں کیسی (۱۹۷۸ء) اور سید انیس جیلانی مقبوضہ ہندوستان (۱۹۷۰ء) رپورتاژ کی تکنیک میں ہے۔

فلیش بیک کی تکنیک:

کچھ سفر نامہ نگاروں نے فلیش بیک کی تکنیک کو بھی نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے استعمال کیا ہے اور یہ فلمی اور ڈرامائی تکنیک ہے جس کے سہارے مصنف ماضی کی وادیوں میں چلا جاتا ہے اور حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی داستان بھی اپنے سفر نامے میں اس خوب صورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ سفر نامے کا حصہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس طریقے کو فلیش بیک کہتے ہیں۔ اس تکنیک سے اشفاق احمد نے اپنے سفر نامے سفر در سفر (۱۹۸۱ء)، قرۃ العین حیدر دکھلایے لے جا کے اسے مصر کا بازار (۱۹۷۴ء)، ، محمود نظامی کا نظر نامہ (۱۹۵۸ء)، اور ممتاز مفتی نے ہند یاترا (۱۹۸۵ء)، میں اس تکنیک سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> اشفاق احمد کا سفر نامہ اس فلم کی طرح ہے جس میں فلیش بیک تکنیک سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں لیکن اگلے قدم پر ہی ماضی اس کا دامن تھام لیتا ہے۔(۹)

جدید سفر نامہ نگاروں میں محمود نظامی بھی اپنے سفر نامے میں عہد رفتہ کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں اور اُن کا قلم بڑی روانی کے ساتھ اندرونی کیفیات و تاثرات کو پوری جزیات اور حاکمانہ قدرت کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ بعض مقامات دیکھ کر چشم تصور میں زمانوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے اہرام مصر پہنچ جاتے ہیں اور ایک ایک جز کو ایسے سمیٹتے چلے جاتے ہیں کہ تمام واقعات پر صداقت کا گمان ہوتا ہے۔

منظوم سفر نامے کی تکنیک:

دنیائے ادب کے بہترین سفر نامے نثر میں ہی لکھے گئے ہیں اس لیے کہ نثر تفصیل کی زیادہ متحمل ہوتی ہے اور اس کے برعکس نظم منظوم صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ منظوم سفر نامے نہیں لکھے جا سکتے بلکہ مثنوی اور مسدس کی ہیئت میں یہ سفر نامے لکھے گئے ہیں جو اس دور کی مقبول ترین صنف تھی اور کچھ حج ناموں میں نظم کی صنف کو عشق رسول ﷺ کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اردو کے منظوم سفر ناموں میں قلق لکھنوی کا سفر آشوب (۱۸۷۲ء)، سندھی خان صفی کا تحفۂ بنگال (۱۹۲۰ء)، ضیاء القادری بدایونی کا دیارِ نبی (۱۹۴۹ء)، واجد علی شاہ کا حزن اختر (۱۹۰۱ء) قابلِ ذکر ہیں۔

سفر ناموں کا اسلوب:

کسی بھی ادیب و فنکار کے طرزِ تحریر یا لکھنے کے انداز کو اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب کسی بھی شخصیت کا اندازِ تحریر ہے جس سے لکھنے والے کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی کوئی مصنف اور شاعر اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جو انداز یا رویہ اختیار کرتا ہے وہی اس کا اسلوب کہلائے گا۔ اس طرح اسلوب سے مراد طرزِ تحریر، انداز، اظہارِ بیان، طرزِ بیان، راہ، روش، اسٹائل، رنگ وغیرہ کے ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کے شعور سے وجود میں آتا ہے اور چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اُس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفۂ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مِل جُل کر حصّہ لیتے ہیں اور اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔[۱۰]

ہر تخلیق کار کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور وہ اس پر چل کر اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح ہر لکھنے والا اپنے لیے ایک الگ راہ نکالتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے، اظہار کا یہی انداز و بیان اس کا اسلوب ہے۔ اسلوب کا تعلق کسی فرد کی جدت اور انفرادیت سے ہوتا ہے۔ یہ جدت ہی کسی ادیب و شاعر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ایک الگ صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے متعارف کرواتی ہے۔ سید عابد علی عابد اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔"[۱۱]

اسلوب مصنف کی سوچ کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ شخصیات کا تضاد اور ان کی جداگانہ حیثیت اسلوب ہی طے کرتا ہے۔ کسی بھی ادیب و شاعر کے اسلوب پر اس کا عہد بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلوب کی اہمیت ادب میں بہت زیادہ

ہے ایک طرح سے کسی ادب پارے کا اسلوب سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے۔ سفر نامہ ایک ایسا نثری بیانیہ ہے جس میں سفر نامہ نگار اپنے محسوسات، مشاہدات، تاثرات اور تجربات کو تحریری صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورانِ سفر اپنی ظاہری و باطنی آنکھیں کھُلی رکھے اور گرد و پیش کا بڑی ذہانت اور باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اپنے محسوسات کو خوبصورت زبان و بیان سے تحریر کرے۔ سفر نامے میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار کا اسلوب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اسلوب اس کی ذہنی کیفیات اور جذبات کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے سفر نامے میں گہرا مشاہدہ اور طرزِ بیان یا اسلوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ سفر نامے سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جو بہت خوبصورت اندازِ تحریر میں لکھے گئے ہوں۔ سفر نامے میں اسلوب کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> سفر نامہ چوں کہ ہر قاری کی نظر سے گزرنے والی تحریر ہے لہٰذا سفر نامہ نویس کو عام فہم اور سادہ اسلوب استعمال کرنا چاہیے۔ واقعات کے بیان اور زبان پر خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ عام ذہنی سطح کا آدمی اُسے پڑھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ سفر نامے کی زبان جس قدر آسان، سلیس اور عام فہم ہو گی اسی قدر سفر نامہ کامیاب تصور کیا جائے گا۔ (۱۲)

سفر نامہ نگاری بھی ایک فن ہے جسے کمال تک پہنچانے کے لیے زبان و بیان کی خوبیوں کا ہونا اشد ضروری ہے جو سفر نامے کو ادبی حُسن بخشتی ہیں۔ ایک سفر نامہ نگار کا اندازِ تحریر ایسا دلچسپ ہونا چاہیے کہ قاری جب اس کی تحریر کا مطالعہ کرے تو اس کو ختم کر کے ہی دم لے۔ آج کے دورِ جدید میں سفر نامہ نگاری میں بھی اسلوب کے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ ہر سفر نامہ نگار نے سفر نامہ لکھنے کے لیے اپنی پسند کے اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ بعض سفر نامے مزاحیہ اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہیں۔ کچھ نے اپنے سفری تاثرات کو سوانحی پیش کش کے رنگ میں ڈھالا۔ بعض ایسے بھی سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے شاعری کے اسلوب کو اپنایا، صحافیانہ اسلوب کے سفر نامے بھی لکھے گئے ہیں۔

افسانوی اسلوب:

جدید سفر نامے میں اسلوب اور طرزِ بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض اوقات سفر نامہ ایسی صورتحال اختیار کر لیتا ہے جیسے سفر نامے کا سیاح سفر نامے کا ہیرو ہو اور دورانِ سیاحت ملنے والی ہر لڑکی اس پر عاشق ہے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک سچے سیاح ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں قاری کو کمال کی خوبصورت دنیا دکھائی ہے۔ اس کا افسانوی اسلوب زندگی اور اس کی حقیقتوں سے اس قدر قریب ہے کہ ان کے سفر ناموں کے طلسماتی حصار سے نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی انداز و تحریر سے سفر نامہ کی صنف کو بامِ

عروج تک پہنچایا ہے۔ ان کے سفر ناموں پر افسانوں اور ناولوں کا گمان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے سفر ناموں میں شوخی و شرارت بھی پائی جاتی ہے۔

مزاحیہ اسلوب:

سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں صرف حادثات و واقعات اور خوبصورت مناظر کی منظر کشی ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کو بھی سمو کر کہانی کا تانا بانا بنتا ہے۔ وہ سفر نامے کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے بہت سے دوسرے حربے بھی استعمال کرتا ہے۔ بعض اوقات افسانوی رنگ، شعری اسلوب اور مزاح کو شامل کر کے سفر نامے میں شگفتگی اور ہنسی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سفر نامہ بظاہر ایک سنجیدہ صنف ہے مگر بعض اوقات سفر نامہ نگار جب زندگی کو غیر متوازن، ناہموار اور اپنے اردگرد کی بے اعتدالیوں، حماقتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی ذات کو شامل کر کے مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہے اور یوں سفر نامہ مزاحیہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ جب ایک سیاح اپنی تہذیب و معاشرت کا دیگر ممالک کی تہذیب سے موازنہ کرتا ہے تو اس کو غیر سنجیدہ انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض سفر نامہ نگاروں نے لطائف کا سہارا لے کر بھی شگفتگی پیدا کی ہے۔ اردو کے جن مزاح نگاروں نے سفر نامے میں مزاح کے روّیے کو برتا ہے۔ ان میں عطاء الحق قاسمی کا گوروں کے دیس میں (۱۹۷۲ء) اور شوق آوارگی (۱۹۷۷ء)، کرنل شفیق الرحمان کا دجلہ (۱۹۸۰ء)، اختر مونکا کا پیرس ۲۰۵ کلومیٹر (۱۹۸۳ء)، ابنِ انشاء کا چلتے ہو تو چین کو چلیے (۱۹۷۰ء)، اور ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں (۱۹۷۴ء)، پطرس بخاری کا سفر لندن (۱۹۸۰ء) وغیرہ۔ یہ سفر نامے مزاحیہ اسلوب کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پطرس بخاری کے اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

> سفر انگلستان کے متعلق پطرس بخاری کے خطوط بنام امتیاز علی تاج اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میں ہر ہر منظر پر پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پطرس بخاری کے یہ خطوط سفر نامے کی روایت میں اس اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ اس کے بعد اردو سفر نامے میں مزاح کا عنصر لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔ (۱۳)

اردو ادب میں سفر نامے کی صنف کو مقبول بنانے میں جہاں دوسرے ادیبوں کا ہاتھ ہے وہاں مزاح نگاروں نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ان سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے کو ایک خاص مزاحیہ اسلوب عطا کیا ہے۔ ان کے سفر نامے اپنے اسلوب کی شگفتگی، بیان کی بے ساختگی اور زبان کی شوخی کے اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں کارٹون کے علاوہ مزاح کے دیگر حربے، تحریف، طنز، ظرافت، مقابلہ، موازنہ وغیرہ سے مزاح پیدا کیا ہے۔

بیانیہ اسلوب:

قدیم سفر ناموں میں سیاح اپنے ارد گرد سرسری نظر ڈال کر صرف مناظر کی تصویریں ہی پیش کرتے تھے۔ حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے جذبات و

احساسات کو پسِ پشت ڈال کر اور خوبصورت مناظر سے خود کو خارج کر کے سفر نامے کو شہروں، تاریخ، جغرافیہ، معاشرت اور لوگوں کی بود و باش کا غیر جذباتی اور غیر تخلیقی بیان بنا دیتے تھے۔ ان کے سفر ناموں میں معروف شہروں، عمارتوں اور واقعات کا بیان زیادہ ہوتا اور باطنی احساسات اور محسوسات کا بیان، جو کہ سفر نامے کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے بہت کم عمل میں آتا تھا۔ اس عہد کے سفر ناموں میں محض شہروں کی بنیادی معلومات اور سفر کی صعوبتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ تخلیقی تجربے سے ان کے دور کا تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ان سفر ناموں کا اسلوب سادہ، سپاٹ، سنجیدہ اور معلوماتی گائیڈ بک کا سا تھا۔ قدیم سفر نامہ نگار اپنی زیادہ توجہ معلوماتی کوائف جمع کرنے پر صرف کرتے تھے اور حقیقت، حالات و واقعات پر ذاتی تاثرات کو غالب نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کا اسلوب سادہ اور بیانیہ کا انداز معلوماتی اور تاریخی ہوتا تھا۔ وہ صرف سفری احوال کی سرگزشت کے بیان کو ہی ضروری سمجھتے تھے اور ان احوال کو بیان کرنے کا انداز خشک اور سپاٹ نثر کا سا ہوتا تھا۔

شعری اسلوب:

سیاح کے لیے نئی زمینیں، نئے مناظر، نئے لوگ اور نئی طرزِ بود و باش ہمیشہ سے پُر کشش اور پُر اسرار رہی ہیں۔ یہ سب اس کے لیے کسی عجائب سے کم نہیں، وہ انھیں دیکھ کر بچوں کی طرح مچلتا ہے اور تمام کیفیات کو دل پر محسوس کر کے، اس میں دوسروں کو شامل کرنے کی خاطر تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور اپنے ذاتی تاثرات و مشاہدات کو ادبی اسلوب کے ساتھ سفر نامے کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ دوسری اصناف کی طرح سفر نامے میں بھی طرزِ تحریر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہی سفر نامہ کامیاب سمجھا جائے گا جس کا اندازِ تحریر سہل اور عام فہم ہو گا۔ ابتداء سے لے کر اب تک کے سفر نامے مختلف اسالیب میں تخلیق کیے گئے ہیں۔ جدید دور میں سفر نامے کو شعری اسلوب میں پیش کرنے کا انداز بھی نمایاں ہوا ہے۔ بہت سے شاعر سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے میں غزل کی شعری روایت کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے تاثرات کو شعری وسائل سے پیش کیا ہے۔ بعض اوقات وہ بے ساختہ اور بے تکلف کیفیت میں اشعار اور مفرد مصرعے بھی لکھ جاتے ہیں اور اسی طرح کچھ سفر ناموں میں تشبیہہ، استعارہ اور رعایت لفظی کو بھی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے جیسے بلدیو مرزا کا سفر نامہ ستروگا (۱۹۸۴ء)، بشری رحمن کا براہِ راست (۱۹۸۳ء)، ، وحیدہ نسیم کا حدیثِ دل (۱۹۸۰ء) اور جمیل الدین عالی کے دنیا مرے آگے اور تماشا میرے آگے (۱۹۷۵ء) خوبصورت شعری اسلوب کا شاہکار ہیں۔ جمیل الدین عالی بنیادی طور پر ایک شاعر بھی ہیں۔ انھوں

نے اپنے سفر ناموں میں شعری اسلوب کا بہترین استعمال کیا ہے اور سفر نامے کے نثری اسلوب کو شعری اسلوب کا جامہ پہنایا ہے۔ جمیل الدین عالی کے شعری اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ آگے چلو میاں برلن دکھاؤ۔ مادام کی کوئی بات سناؤ، کوئی سنسنی خیز، چٹپٹی بات یا کسی قحبہ خانہ میں لے چلو یا کوئی غزل سناؤ۔ کیونکہ

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مئے ناب وسفینہ غزل است (۱۴)

وحیدہ نسیم کے سفر نامہ حدیثِ دل کے اسلوب کے متعلق مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

خواتین کے ہی کیا، جملہ حجاز ناموں میں "حدیث دل" کی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔ شعری لحن نے اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ (۱۵)

انشائی اسلوب:

ان تمام سفر نامہ نگاروں کے علاوہ چند ایک سفر نامہ نگاروں نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر سفر نامے میں دیگر اصناف کو استعمال کرنے کے شاندار تجربات کیے ہیں جیسے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے سفر نامہ ایک طویل ملاقات (۱۹۷۶ء) کو انشائی مزاج میں تحریر کیا ہے جو نہ صرف قاری کو سفر ہند کی روداد سناتا ہے بلکہ اس میں وزیر آغا کی ذات کے مخفی گوشے بھی آشکار ہوتے ہیں۔

دیکھا جائے تو اردو سفر نامہ زیادہ پرانی صنف نہیں ہے مگر پھر بھی اس نے بہت کم عرصے میں خود کو ایک بڑی اصناف کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں سفر نامے کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سفر ناموں میں دیگر غیر افسانوی اصناف کے ساتھ ساتھ افسانوی نثر کا ذائقہ بھی موجود ہے اور قاری ایک وقت میں بہت سی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فاروقی، احسن، فکشن اور تکنیک، مشمولہ سیپ، شمارہ ۲۹، کراچی، ص ۱۹۳۔
۲۔ شفیع عقیل، زندگی بھر کہاں، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۹۔
۳۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفر نامے، بھارت آفیسٹ، دہلی، س۔ن۔، ص:۴۲۔
۴۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیر یورپ، یونین اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۸ء، ص:۱ (تمہید)۔
۵۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۶۔
۶۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۴۴۳۔
۷۔ طیب علی، عبد الرسول، تذکرۂ سیفی (مرتبہ)، (جبل پور: مطبع نادری، ۱۹۳۰ء)، ص:۳۔

۸۔ رحمٰن مذنب، (مقدمہ) اردو میں سفر نامہ از ڈاکٹر انور سدید، ص:۲۰۔۲۱۔

۹۔ انور سدید، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۱۳۔۴۔

۱۰۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص:۱۳۔

۱۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص:۳۶۔

۱۲۔ روبینہ شاہین، سفر نامے کے بنیادی مباحث، مشمولہ، خیابان، (خزاں ۲۰۱۴ء)، ص:۱۷۰۔

۱۳۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۹۱۔

۱۴۔ عالی، جمیل الدین، تماشا مرے آگے، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۵۷۔

۱۵۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص:۳۵۔

References in Roman Script:

1. Farooqi, Ahsen, Fiction aur technique, mishmoola, seep, karachi, shumara 29, p,193
2. Shafi Aqeel, Zindagi bhar kahan, Book Home, Lahore, 2006, p,9
3. Muhammad Shahabudeen, Urdu mein Haj k Safar namay, Ofset, Dehli, P42
4. Nazli Rafia Sultan, Sair e Europe, union steem press, Lahore, 1908, P, Tamheed
5. Qudsia Qureshi, Doctor, Urdu safar namay uneeswen said mein, P26
6. Anwar Sadeed, Urdu Adab mein safar nama, Magharabi Pakistan urdu academy, 1987, p443
7. Tayyab Ali, Abdul rasul, Tazkara e Saifi, Muratab, matab nadri, Jabal pur, 1930, p3
8. Rehman Muznab, muqadma, urdu me safar nama, anwar sadeed, Doctor, p20, 21
9. Anwar sadeed, Doctor, Urdu safarnamay ki mukhtasar tareekh, p413
10. Hafeez sidiqui, Abu al ejaz, Kashaf Tanqidi istelahat, p13
11. Syed Abid Ali Abid, usloob, majlis e taraqi adab, 1971, p36
12. Rubina Shaheen, safarnamay k buneyadi mubahis, mishmoola Khyaban, Khizan 2014, p170
13. Mirza hamid Baig, urdu safar namay ki mukhtasar tareekh, p91
14. Aali, Jameel udeen, tamasha mery agay, Ghulam ali and sons, Lahore, 1975, p57
15. Mirza hamid Baig, urdu safar namay ki mukhtasar tareekh, p35

انڈیکس سدرہ طاہر

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	ملخص	کلیدی الفاظ
ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	ترقی پسند شعری روایت اور اردو غزل	۱-۲۰	اس مقالے میں اردو غزل کا جائزہ ترقی پسند شعری روایت کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے ۔ جس میں اردو غزل کے بدلتے ہوئے رویوں پر بحث کی گئی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے شاعری کے روایتی اصولوں کے برعکس معاشرتی، معاشی اور سیاسی حقائق کا منظر نامہ پیش کیا اور روایتی موضوعات کو وسعت عطا کی۔ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات کے مطالعے اور غزل کے موضوعات کو وسعت بخشنے والے اہم شعرا اور غزل کی ترقی پسند تاریخ سے روشناس ہونے کے لیے یہ مقالہ اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں شعری روایت اور اردو غزل کے تاریخی حقائق کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جس نے غزل کو وسعت عطا کی۔	ترقی پسند، شعری روایت، معاشرتی، تاریخی حقائق، غزل گوئی کی تحریک، معدوم، تاریخی حقائق
لی فانگ دا/ ڈاکٹر یوان یو ہانگ	چین میں اردو تدریس کی روایت کا تجزیہ	۲۱-۲۹	اس تحقیقی مقالہ کے ذریعے چین میں اردو تدریس کی، روایت صورتحال، مسائل اور امکانات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے ، چین اور پاکستان کے تعلقات کی بنیاد مستحکم ہونے کی وجہ سے چین میں بھی اردو تعلیم کو اہمیت حاصل ہوئی یوں چین میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ یہ مقالہ چین میں تدریس اردو کے آغاز و ارتقا سے نہ صرف روشناس ہونے میں مدد فراہم کرتا ہے بلکہ چین میں اردو زبان کی تدریس کو درپیش مسائل کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ نیز اس مقالے میں جدید تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اساتذہ کی تربیت کے لیے نئی حکمت عملیاں پیش کی گئی جن کو بروئے کار لاتے ہوئے ترقی کی منازل طے کی جاسکتی ہیں۔	چین، تدریس، شعبہ اردو کی تعمیر، روایت، پاک چین تعلقات، حکمت عملی، قومی زبان

ڈاکٹر محمد حامد / ڈاکٹر سلمٰی اسلم	اردو تحقیق میں 'نمونہ بندی' کی تکنیک کا استعمال: ایک جائزہ	۳۰-۴۱	تحقیق کا انداز و طریق صرف سائنس و ٹیکنالوجی تک محدود نہیں رہا۔ سماجی علوم بھی چوں کہ سائنسی طریقے کی زد میں آرہے ہیں۔ یہاں بھی توثیق و اعادہ کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ نئے مباحث اٹھائے جارہے ہیں اور تحقیق کے جدید طریقوں کا استعمال رواج پارہا ہے جب کہ موضوعیت، اندازہ، قیاس، تاثر و وجدان کو چھوڑا جارہا ہے اور تجربیت و عملیت کو اہمیت دی جارہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں جامعات میں ہونے والے تحقیقی مقالوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو تحقیق میں 'نمونہ بندی' کی تکنیک کے استعمال کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے نمونہ بندی کی تکنیک کے استعمال اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس روشنی میں نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔	اردو تحقیق، نمونہ بندی، تکنیک، سائنسی، قیاس، موضوعیت، عملیت، پارکھی، عمرانی، لسانی وادبی
وسیم عباس / ڈاکٹر عزیز ابن الحسن	"جانگلوس" میں تانیثیت کے مقامی پہلو: تجزیاتی مطالعہ	۴۲-۵۵	شوکت صدیقی اردو ادب کے معروف ترقی پسند فکشن نگار ہیں۔ ان کا ناول "جانگلوس" پاکستانی معاشرے کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ اس تحقیق میں ان کے ناول "جانگلوس" کا تجزیہ تانیثیت کے نظریے کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں استحصال، پسماندگی اور جبر جیسے مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے جن کا سامنا خواتین کو معمولات زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔ یہ تحقیق نہ صرف متنی تجزیہ ہے بلکہ ناول کے سیاق وسباق اور ثقافتی مطالعے کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اس ناول کے تناظر میں زرعی پیداوار میں خواتین کے کردار اور دیہی رسم و رواج کے مطابق خواتین کے مقام کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔	جانگلوس، ترقی پسند، پاکستانی معاشرہ، مقامی، تانیثیت، استحصال، پسماندگی، جبر، ثقافتی، دیہی

ڈاکٹر محمد عامر اقبال / ماریہ بلال	اقبال کی فکری سرگزشت: تحقیقی مطالعہ	۵۶-۶۷	یہ تحقیقی کام اقبال کی فکری سرگزشت کے تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔ گوناگوں صفات سے لب ریز اقبال کی سرگزشت کے پیچ وخم کو سمجھے بغیر اقبال کے افکار واشعار کا مقام یا ان کے سرچشموں کی نشان دہی مشکل ہے۔ اقبال کے ذہن و فکر کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ اقبال کے اسلوب فکر کا انداز کیا تھا؟ اقبال کے ذہن و فکر نے کس طرح ارتقائی منزلیں طے کیں؟ ان میں کتنے اور کس طرح کے سنگ راہ حائل ہوئے اور اقبال کا کاروان فکر کن مراحل سے گزر کر اپنی منزل مقصود تک پہنچا۔ اقبال کا فکر و فلسفہ کے متعلق کیا نقطہ نظر تھا؟ اور کس سلسلہ فکر سے ان کا تعلق خاص رہا؟ ناقدین اقبال کا خیال ہے کہ اقبال نے مشرق سے فیضان نظر حاصل کیا جبکہ دوسرا بھی ایک گروہ ہے جو کہتا ہے کہ اقبال کے خیالات مغرب سے ماخوذ ہیں ۔ جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مشرق یا مغرب نہیں بلکہ اقبال کا فکر و نظر خود ان کا اپنا ہی تخلیق کردہ تھا۔ یہ فکر و نظر مشرق و مغرب کے سرچشموں سے سیراب ہے۔ چند ناقدین کے خیالات پیش کر کے نتیجہ اخذ کرنا گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی سرگزشت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔	سرگزشت، فکری، پیچ وخم، فلسفہ، الہیاتِ اسلامیہ، واعظ، مسولینی، حرکت و عمل، اجتہاد
ڈاکٹر وجیہہ شاہین / ڈاکٹر قمر عباس	ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نظم نگاری	۶۸-۸۵	ڈاکٹر طاہر تونسوی اردو زبان و ادب کے ممتاز محقق، نقاد اور شاعر ہیں۔ یہ مقالہ ان کی نظم گوئی کی خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے۔ اردو شعری روایت میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات کارآمد ہیں۔ ان کی نظمیں قارئین کو اردو شاعری کی روایت سے جوڑتی ہیں نیز جدید موضوعات اور اسلوب کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ اس مقالے میں ان کی نظموں کے موضوعات جن میں پیغمبر اسلام	اقدار، نظم گوئی، اسلامی ثقافت، خاندان، نگارشات، منظومات، نغمگی، عظمت و فضیلت، سراپا نگاری

			(ص)، ان کے مقدس خاندان اور اسلامی ثقافت سے بے پناہ محبت، عظیم انسانی اقدار اور تاریخی شعور کی بھرپور عکاسی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔	
عظمت شہزاد / ڈاکٹر غنچہ بیگم	خالد فتح محمد کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری	۸۶-۹۴	خالد فتح محمد منفرد لہجے کے فکشن نگار ہیں۔ ان کی فکشن میں سماجی شعور کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ اس تحقیق میں خالد فتح محمد کے افسانوں میں پائی جانے والی معاشرے کی مبہم حقیقتوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ خالد فتح محمد کی کہانیوں میں گہرا سماجی شعور ملتا ہے جو فرد کی داخلی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کو بہ طریق احسن منظر عام پر لاتا ہے۔ یہ مقالہ خالد فتح محمد کے افسانوں میں پائے جانے والے زندگی کے تمام تر پہلو آشکار کرنے، سماج میں پھیلی بے راہ رویوں، شدت پسندی، بھوک افلاس، طبقاتی کشمکش نفسیاتی اور سماجی تناظرات کے حوالے سے مختلف زاویوں کو اجاگر کرتا ہے۔	جغرافیائی، جذباتی، سماجی شعور، نفسیاتی الجھنوں، شدت پسندی، خود کلامی، اخلاقی اقدار، مشرقی سماج
ڈاکٹر اللہ یار ثاقب / ڈاکٹر سائرہ ارشاد	مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں سماجی و نفسیاتی تناظرات	۹۵-۱۰۳	اس مقالے میں مصطفیٰ کریم کے افسانوں میں سماجی و نفسیاتی تناظرات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مصطفیٰ کریم اردو کے ایک عہد ساز افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف افسانے کی روایت کو قائم رکھا بلکہ افسانے کے مشرقی و مغربی تناظر میں نئی تروتازگی بھی بخشی ہے۔ ان کے افسانے تکنیکی، فنی اور موضوعاتی لحاظ سے اہم ہیں۔ موضوعات میں مشرقی و مغربی معاشرت، جنگِ عظیم اول و دوم، تقسیم ہند، ہجرت کے مسائل، مذاہب میں تشدد، انسانی رواداری، طبقاتی تقسیم کے علاوہ تارکین وطن کے مسائل، جنسی آزادی، بے راہ روی کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔	عصری، مشرقی و مغربی، واقعات و سانحات، نشیب و فراز، تحلیلِ نفسی، المیہ، مصور، مینا کاری

ڈاکٹر روبینہ پروین	سفر ناموں کا تکنیکی اور اسلوبیاتی مطالعہ	۱۱۵-۱۰۴	یہ مقالہ سفر ناموں کے تکنیکی اور اسلوبیاتی مطالعہ کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے سفر نامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تکنیک کے نت نئے تجربات کیے جارہے ہیں۔ اردو کے ابتدائی سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر نامے، خطوط، ڈائری اور روزنامچے کی تکنیک میں تحریر کیے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی طرح سفر ناموں میں بھی کئی تکنیکیں استعمال کی گئیں ہیں جیسے فلیش بیک، رپورتاژ، مکالماتی، آپ بیتی وغیرہ۔ تاکہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں سے منفرد نظر آئے۔اس مقالے میں اردو سفر ناموں میں پائی جانی والی مختلف تیکنیکوں اور ان کے استعمال کو اجاگر کیا گیا ہے۔	تکنیکی، اسلوبیاتی، خطوط، ڈائری، روزنامچے، فلیش بیک، رپورتاژ، مکالماتی، آپ بیتی،

CONTENTS

Editorial		
Progressive Poetic Tradition and Urdu Ghazal	Dr. Mirza Hamid Baig	1
Review on the Teaching of Urdu in China	Li Fangda/ Dr. Yuan Yuhang	21
Use of ‘Sampling’ Technique in Urdu Research: An Analysis	Dr. Muhammad Hamid/ Dr. Salma Aslam	30
Local Aspects of Feminism In “Jangloos”: An Analytical Study	Waseem Abbas/ Dr. Aziz Ibn ul Hassan	42
Iqbal’s Intellectual History: A Research Study	Dr Muhammad Amir Iqbal/ Maria Bilal	56
Dr. Tahir Taunsvi’s Art of Poem Writing	Dr. Wajeeha Shaheen/ Dr. Qamar Abbas	68
Social Realism In Khalid Fateh Muhammad’s Short Stories	Azmat Shehzad/ Dr. Ghucha Begum	86
Socio-psychological perspectives in Mustafa Karim's fiction	Dr. Allah Yar Saqib/ Dr. Saira Irshad	95
A Technical and Stylistic Study of Travelogues	Dr. Robina Parveen	104
Index	Sidra Tahir	116

“Daryaft”

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

Research Journal of Urdu Language & Literature

Published by: National University of Modern Languages, Islamabad

Department of Urdu Language & Literature

Subscription / Order Form

Name: ____

Mailing Address: ____________________________________

____

City Code: _______________Country: _______________________

Tel: _____________________ Fax: __________________________

Email:____

Please send me __________________ copy/ copies of The “Daryaft”

I enclose a receipt of Online Fund Transfer of Pkr/US$ ________In Daryaft Account No: 0550380006660, Askari Bank I-9 Branch, Islamabad.

Signature: ________________ Dated: _________________________

Note:
Price per Issue in Pakistan: Pkr 600 (including Postal Charges)
Price Per Issue other countries: US$ 5 (excluding Postal Charges)
Please return to: Department of Urdu Language & Literature,
NUML, H-9/4, Islamabad, Pakistan
Phone: 051-9265100-10, Ext: 2262

DARYAFT

Vol: 15, Issue: 01

January -June 2023

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

"DARYAFT" is a HEC Recognized Journal

It is included in Following National & International Databases:

1. DOAJ (Directory of Open Access Journals)
2. Crossref
3. MLA database (Directory of Periodicals & MLA Bibliography)
4. Index Urdu Journal (IIUI),
5. International Scientific Indexing (ISI)
6. Scientific Indexing Services (SIS)
7. Tehqeeqat, A Research Indexing System
8. EuroPub (Directory of Academic and Scientific Journals)

Department of Urdu Language and Literature,
National University of Modern Langauges, Islamabad

ADVISORY BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Heinz Werner Wessler
Department of Linguistics and Philology, Uppsala University, Uppsala, Sweden

Prof. Dr. Shahabuddin
Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, India

Prof. Dr. Moinuddin A. Jinabade
Centre for Indian Languages, School of Language Literature and Cultural Studies, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Muhammad Mahfooz Ahmad
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities & Languages, Jamia Millia Islamia, New Delhi, India

Dr. Arzu Suren
Department of Urdu, University of Istanbul, Istanbul, Turkiye

ADVISORY BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Khalid Mehmood Khattak
Chairperson, Department of Urdu, University of Balochistan, Quetta, Pakistan

Prof. Dr. Zia Ul Hassan
Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Robina Shaheen
Head, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar, Pakistan

Prof. Dr. Saima Irum
Chairperson, Department of Urdu, Government College University, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Sohail Abbas
Chairperson, Department of Urdu, Ghazi University, Dear Ghazi Khan, Pakistan

EDITORIAL BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Halil Toker
Head of Urdu Language and Literature Chair, Istanbul University, Istanbul, Turkiye

Prof. Dr. Khawaja Ikram ud Din
Department of Urdu, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Asuman Belen Ozcan
Head, Department of Urdu, University of Ankara, Ankara, Turkiye

Prof. Dr. Mehmoodul Islam
Department of Urdu, Faculty of Arts, Dhaka University, Dhaka, Bangladesh

Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities, Al-Azhar University(Girls Campus) Madeent Nasr, Cairo, Egypt

EDITORIAL BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Abdul Aziz Sahir
Dean, Faculty of Social Sciences and Humanities, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Prof. Dr. Muhammad Kamran
Director of the Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of the Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Tanzeem-ul-Firdous
Head, Department of Urdu, University of Karachi, Karachi, Pakistan

Prof. Dr. Rubina Tareen
Department of Urdu, B.Z University, Multan, Pakistan

Cover Page: Sheki Caravanserai, Sheki, Azerbaijan
Photographer: Dr. Zafar Ahmed

FOR CONTACT
Department of Urdu Language & Literature,
National University of Modern Languages, H-9, Islamabad
Telephone: 051-9265100-10, Ext: 2262
E-mail: daryaft@numl.edu.pk
Website (OJS): *https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft*

DARYAFT

Vol: 15, Issue: 01

January -June 2023

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

PATRON IN CHIEF
Maj. Gen. ® Muhammad Jaffar HI (M) (Rector)

PATRON
Dr. M. Zubair Iqbal (Pro-Rector Research &Strategic initiatives Division)

CHIEF EDITOR
Prof. Dr. Jamil Asghar Jami (Dean Faculy of Languages)

EDITOR
Dr. Zafar Ahmed

CO-EDITOR
Mr. Arshad Mahmood Haadi

RESEARCH ASSISTANT
Ms. Sidra Tahir

NATIONAL UNIVERSITY OF MODERN LANGUAGES

ISLAMABAD

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

DARYAFT

Research Journal
Volume:15, Issue:01
January-June 2023

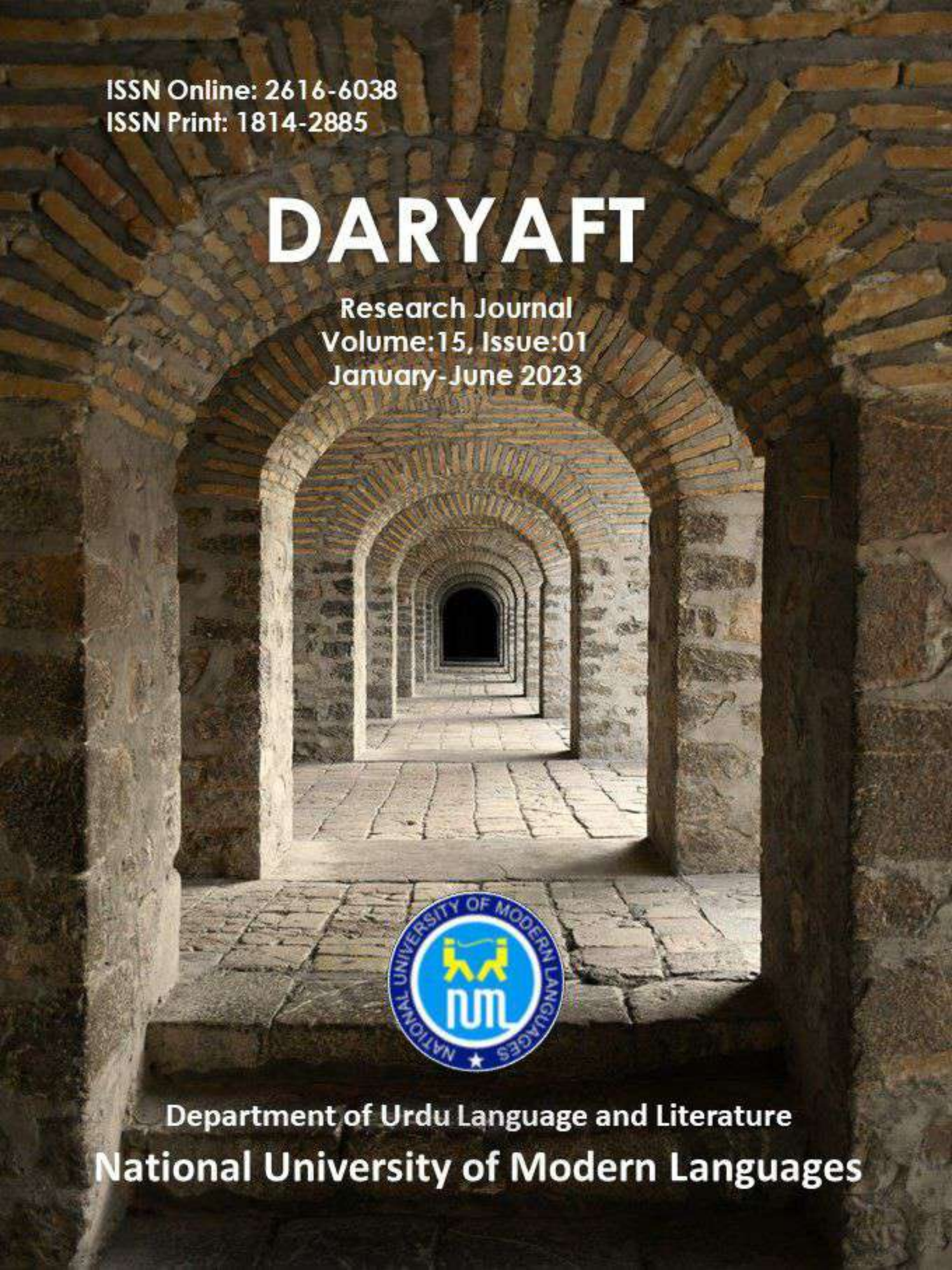

Department of Urdu Language and Literature
National University of Modern Languages